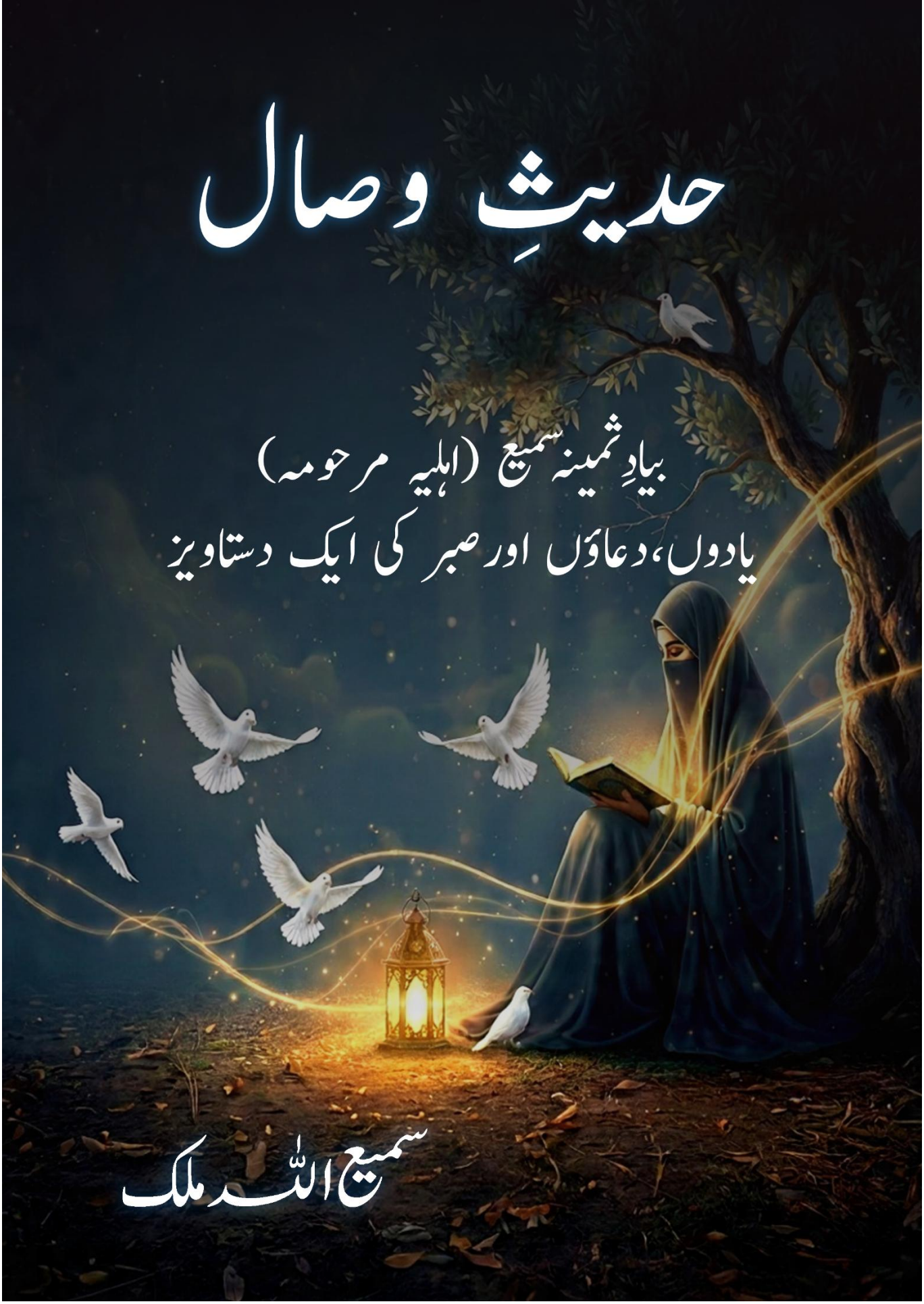

حدیثِ وصال
بیادِ ثمینہ سمیع (اہلیہ مرحومہ)
یادوں، دعاؤں اور صبر کی ایک دستاویز
سمیع اللہ ملک

حدیثِ وصال

فہرست حدیثِ وصال

سیریل نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
1	معتبر نام کی کیا شئے ہے فریب ہستی!	5
2	انتساب	7
3	عرضِ مصنف	13
4	ابتدائیہ	16
5	حروفِ مہرباں	19
6	چند گزارشات قارئین کے نام	46
7	فہرست ابواب	47
8	**پہلا باب:** امہات المؤمنینؓ اور اسلامی تاریخ کی روشنی میں: شوہر کی کامیابی اور قلبی سکون میں بیوی کا کردار	48
9	**باب دوم:** خاندان کی بنیاد میں شوہر کا کردار: قیادت، عدل، محبت اور ذمہ داری	52
10	**باب سوم:** ازدواجی تعلق میں باہمی مشاورت اور اختلاف کا حسن: فہم برداشت اور محبت کے ساتھ جینے کا قرآنی طریقہ	56
11	**باب چہارم:** دعا، صبر اور شکر: کامیاب ازدواجی زندگی کے روحانی ستون	58
12	**باب پنجم:** اولاد کی تربیت میں میاں بیوی کی مشترکہ ذمہ داری: نسلوں کی تعمیر اور کردار سازی	60
13	**باب ششم:** ازدواجی زندگی میں آزمائشیں، صبر اور بحالی: ٹوٹنے سے پہلے سنبھل جانا	63
14	اختتامی باب: کامیاب ازدواجی زندگی: سکون، محبت اور قربِ الٰہی تک پہنچنے کا اسلامی راستہ	67
15	مصنف کی طرف سے چند آخری کلمات	70
16	پکارِ ناگہانی اور آغازِ حکایت	72
17	اقبالؒ کا سوال—اور میرا ضعف	76
18	سپردگی—اور اذنِ سفر	86
19	حدیثِ پاکیزگی: عشقِ رسول ﷺ اور شبِ قدر کی رخصت کی شہادت	88
20	محبت سے بھیگی ہوئی تحریر	94
21	واقعے کا محرّک—یاد کو جگانے والی گفتگو	100
22	حدیثِ وصال کے حاشیے پر—ایک محیر العقول واقعہ	102
23	زندگی کا سب سے قیمتی سبق	108
24	سفرِ آخرت	111
25	روشنی کی پہلی کرن—ابتدائی زندگی اور دینی تربیت	113
26	پہلا سبق: خوفِ خدا اور محبتِ رسول ﷺ کا امتزاج	116

27	ایک جواب جس نے برطانوی پارلیمنٹ تک کو خاموش کر دیا	122
28	پردہ پابندی کے خلاف ایک روشنی کی مہم	123
29	واٹرلو کی قبریں اور ایک حرفِ نصیحت	125
30	حُسنِ ہمسائیگی — نیکی جو لوٹ آتی ہے	127
31	قرآن کے ساتھ اس کا رشتہ — اب تک جاری	131
32	قرآن اور موسیقی	133
33	فالج کی زنجیریں — صبر اور آزمائش	140
34	حدیثِ صبر — آخری مکالمے	141
35	روحانی مکالمہ — سکون اور یقین	147
36	سفرِ آخرت — ایک خاموش وصیت، ایک روشن انجام	151
37	وہ آخری لمحے — جدائی کا زخم، وصال کی امید	155
38	ثمینہ کے ساتھ میرے وہ آخری لمحات	157
39	عرش کی دعوت	160
40	مرثیہ — ثمینہ سمیع، حدیثِ نور	161
41	زیارتِ قبر	162
42	حدیثِ امید — تنہائی اور بیٹی کی آمد	167
43	پرندوں کا راز — وہ محیر العقول نورانی واقعہ جو آج تک کوئی سمجھ نہیں سکا	169
44	وہ دن — جس نے مجھے پہلی بار جھنجھوڑ دیا	171
45	پرندوں کی وفا اور ماں کی مہک	172
46	وفات کے بعد جو منظر شروع ہوا — وہ آج تک رک نہیں سکا	175
47	غیر مسلم زائرین کی حیرت — اور نئے القابات	179
48	بیٹی کی آمد — امید کی روشنی	181
49	روحانی مکالمہ — دل کی تعلیم	183
50	روحانی مکالمہ — فلسفۂ زندگی	185
51	حدیثِ روشنی — اختتام و مستقبل کی امید	188
52	— اور آخر میں	190
53	میری پیاری بیٹی ڈاکٹر قندیل بدر کے نام	199
54	"یادوں کی روشنی میں وصال کا سرود"	201
55	یاد کی لو میں لکھی گئی بات	203

معتبر نام کی کیا شئے ہے فریب ہستی!

خود کو مہمان کیا اپنے ہی گھر میں تو نے
تیرے دیدار کا پھر موقع دوبارہ نہ ملا
اپنے بچوں کا تماشا بھی نہ دیکھا تو نے
حیف، کس وقت تجھے موت کا پروانہ ملا
تیرے جاتے ہی عجب ہو گیا اپنا نقشہ
آشنا بھی لگا جیسے کوئی بے گانہ ملا
شدت قرب کو افشا کیا دوری نے تیری
ذکر تیرا نہ ہو ایسا کوئی لمحہ نہ ملا
یاد میں تیری شب و روز بسر کرتا ہوں
اس سے بہتر کوئی جینے کا سہارا نہ ملا
کوئی دن ہوتا وہ گو روز قیامت ہی سہی
چلتے چلتے بھی ہمیں وعدہ فردا نہ ملا
صحن گلشن میں ابھی پھولوں سے دامن تھا بھرا
یا خدا! راہ میں اب کیسا یہ ویرانہ ملا
معتبر نام کی کیا شئے ہے فریب ہستی!
ہر حقیقت میں تری مجھ کو تو افسانہ ملا
کیسے کیسے ہیں ستم دیدہ مگر بام فلک!

مجھ سے بڑھ کر کوئی تقدیر کا مارا نہ ملا

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان اور بے پناہ رحم کرنے والے ہیں

اور ہم ضرور تمہیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے، تو کہیں کہ "ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف پلٹ کر جانا ہے (البقرہ:155-156)

انتساب

وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ(النور:26)

پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں، اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے

✨ ثمینہ سمیع — ایک پاکیزہ روح کی ابدی کہانی ✨

حَدِيثُ الطُّهْرِ وَالوَفاء

فِراق، صبر، عبادت اور جنتی ملاپ کی روحانی روایت

حديثُ العِبرَتِ وَالعِفَّة:

—ایک ایسی بیوی کی سوانح جس نے حیاء، خدمت، صبر اور قرآن سے محبت کو اپنی زندگی کا تاج بنایا

اور ایک شوہر جس نے اُس کے فراق میں قلم سے دل کے زخم لکھے تاکہ امت سیکھ سکے کہ عورت کی عظمت کیا ہے۔

اُن پاکیزہ خواتین کے نام

جو اپنے گھروں کو عبادت گاہیں،

اپنے وقت کو صدقہ،

اپنی حیا کو قلعہ،

اور اپنی خاموشی کو قرآن کا ترجمہ بنا دیتی ہیں۔

یہ کتاب اُس بیوی کے نام

جس نے حیاء کو اپنا زیور،

خدمت کو اپنا منصب،

صبر کو اپنا تاج،

اور قرآن سے محبت کو اپنی روح کی سانس بنا لیا۔

...ایک ایسی زندگی

جسے دیکھ کر لگتا تھا کہ کچھ لوگ

زمین پر چلتے ہیں، مگر دل آسمانوں میں رکھ کر۔

اور اُس شوہر کی توفیقِ ربانی کے نام

جس کے قلم سے

—فراقِ محبوبہ کی چیخ نہیں

بلکہ شکر، حمد اور رضا کی خوشبو اٹھتی ہے۔

...جو روتا بھی ہے

تو درِ مصطفیٰ ﷺ پر اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو کر۔

...جو ٹوٹتا بھی ہے

تو اللہ کی رضا میں لپٹ کر۔

جو یاد بھی کرتا ہے.....

تو اسے عبادت بنا کر۔

—دو روحیں

ایک دنیا میں جدا،

مگر دوسری.....

جنت کے باغوں میں ایک دوسرے کی منتظر۔

دو روحیں... ایک دنیا میں جدا

اور دوسری جنت میں وِصال کی منتظر۔

یہ کتاب اُن صالح خواتین کے نام جو

وفا، عبادت اور حُبِّ رسول ﷺ سے زندگی کو چراغ بنا دیتی ہیں۔

حَدِيثُ الطُّهْرِ وَالعِزَّةِ
مُعَارَجَاتُ قَلْبٍ مَكْسُورٍ فِي فِرَاقِ زَوْجَةٍ صَالِحَةٍ
—قِصَّةٌ ثمينة سَمِيْع
اِمْرَأَةٍ جَعَلَتِ الْقُرْآنَ رِدَاءَهَا، وَالخَوفَ مِنَ اللهِ سِرَّهَا،
فَكَانَتْ لَهُ فِي الدُّنْيَا سَكَنًا... وَفِي الآخِرَةِ أَمَلًا

طہارت اور عظمت کی داستان

—ایک ٹوٹے دل کی وہ پکار اور مکالمہ جو ایک نیک اور صالح زوجہ کی جدائی میں اٹھا

—یہ ثمینہ سمیع کی کہانی ہے
اس عظیم خاتون کی، جس نے قرآن کو اپنی اوڑھنی بنایا،
...اور اللہ کے خوف کو اپنا گہرا راز اور باطنی سرمایہ
وہ اس کے لیے دنیا میں قرارِ قلب بنی،
—اور آخرت میں امید و نجات کا چراغ

—ثمینہ سمیع کی یاد میں

اُس خاتون کی
جس نے قرآن کو صرف پڑھا نہیں،
بلکہ اس کے ہر وقفے میں اپنے آنسو ٹپکائے،
اس کی ہر آیت میں اپنا دل رکھ دیا،
اور اس کے حاشیوں میں
اپنی روح کے راز چھپا دیئے۔
اُس عورت کے نام
جو گھریلو زندگی میں ولیوں کی طرح خاموش،
مخلوق کے لیے گلاب کی طرح مہربان،
اور اپنے رب کے حضور
صبح و شام ایک تسبیح کی دانوں کی طرح جھکی رہتی تھی۔
جس نے ایمان کو لباس،
حیا کو نقاب،
اور قرآن کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔
وہ جو کہتی تھی:
میری آرزو یہ ہے کہ جنت میں
—مجھے سیدہ فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کی کنیز بنا دیا جائے
کہ یہی میرے لئے سب سے بڑی عزت ہو گی۔
اور آج—

—اس کے جانے کے بعد

یہ بات سمجھ آتی ہے

...کہ اصل حسن عورت کا چہرہ نہیں

اس کا کردار ہوتا ہے۔

اصل تاج اس کے زیورات نہیں.....

اس کی نیکیاں ہوتی ہیں۔

...اور اصل میراث دنیا کے خزانے نہیں

وہ آنسو ہیں جو وہ خدا کے خوف سے بہاتی ہے۔

حدیثِ جَمیلَاتُ الدُّنْیَا وَحُورُ الْآخِرَة:

اُن سب نیک عورتوں کے لیے

جن کے لئے دنیا میں سکون،

قبر میں نور

اور آخرت میں جنت کے دروازے کھلتے ہیں۔

جو اپنے گھروں کو محبتوں سے بھرتی ہیں،

جو شوہروں کے لئے رحمت بنتی ہیں،

جو اولاد کے لئے دعا بنتی ہیں،

جو خاندانوں کے لئے روشنی بنتی ہیں۔

اور جن کے لئے

فرشتے، قبر میں اترتے ہی کہتے ہیں:

"نُورٌ عَلٰی نُورٍ... بِمَا صَبَرْتِ۔"

اُن پاکیزہ عورتوں کی کہانی جن کے لئے

دنیا میں سکون، قبر میں نور، اور آخرت میں جنت کا وعدہ ہے۔

ایک شوہر کے ٹوٹے ہوئے دل کی وہ سچی داستان

جو قرآن کی عاشق، صابرہ و شاکرہ،

پاک دامن اور باکردار بیوی کی یاد میں

آٹھ برس بعد دوبارہ قلم تھامنے کی ہمت سے جنم لیتی ہے۔

نیک اور باحیاء عورت کے لیے

دنیا میں سکون،

قبر میں نور،

—اور آخرت میں جنت کے انعامات

اور ان سب کی ایک زندہ مثال: ثمینہ سمیع

یہ کتاب ایک شوہر کے ٹوٹے ہوئے دل کی وہ روداد ہے

جو آٹھ برس بعد

— محض یاد کے زور سے نہیں

بلکہ اللہ کے نام پر

اپنے غم کو صدقہ بنا کر

قلم ہاتھ میں لیتا ہے۔

یہ قصہ اُس عورت کا بھی ہے

جو قرآن کی عاشق تھی،

شاکرہ تھی،

بردبار تھی،

اور جس کا اخلاق

اس کی قبر کو باغِ جنت بنا رہا ہے۔

اور یہ پیغام ہر قاری کے نام ہے:

...عورت اگر نیک ہو

تو وہ دنیا میں سکون،

قبر میں نور،

اور آخرت میں جنت کا پاسپورٹ بن جاتی ہے۔

—ثمینہ سمیع

...ایک نام نہیں

بلکہ ایک روشنی ہے
جو اپنے پیچھے دلوں میں
سکون کے چراغ چھوڑ گئی۔

حدیثِ مَحبّت و مَحرابِ صبر:

ایک شوہر کی جان سوز روداد،
ایک بیوی کی قرآن آشنا روح،
اور دو دلوں کی وہ کہانی جو دنیا میں بچھڑی..... مگر جنت میں ملنے کی منتظر ہے۔
—نیک، صابر اور باکردار عورت کی سچی کہانی
جہاں دنیا کی وفا آخرت کے ابدی انعام سے جا ملتی ہے

کیا کہوں اپنے چمن سے مَیں جُدا کیونکر ہوا
اور اسیر حلقۂ دامِ ہَوا کیونکر ہوا
تو نے دیکھا ہے کبھی اے دیدۂ عبرت کہ گُل
ہو کے پیدا خاک سے رنگیں قبا کیونکر ہوا
موت کا نسخہ ابھی باقی ہے اے دردِ فراق
چارہ گر دیوانہ ہے، میں لادوا کیونکر ہوا
میرے مٹنے کا تماشا دیکھنے کی چیز تھی
کیا بتاؤں اُن کا میرا سامنا کیونکر ہوا

اقبالؒ

عرضِ مصنف

(ایک شخصی، تاریخی، تہذیبی اور روحانی یادداشتوں کا سفر)

الحمدُ لِلّٰهِ الَّذی جَعَلَ الذِّکرَ حَیاتَ القلوبِ، وَالصَّبرَ رِداءَ الرُّوحِ، وَالفِراقَ مِحَکَّ الوُدِّ وَالصِّدقِ۔والصلاةُ والسلامُ علیٰ سیدِ صاحبِ لواءِ الحمد، شفیعِ یومِ الوعید، سیدنا محمد ﷺ، الذی کانَ ذِکرُهُ شِفَاءً، وَوُدُّهُ حَیاءً، وَنُورُهُ هُدًی۔ أَمَّا بَعْدُ:

أَعُوذُ بِاللهِ السَّمِیعِ الْعَلِیمِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیمِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیمِ

"وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللَّهِ"

تمام تعریفیں اس ربِ کریم کے لیے ہیں جس نے اپنے ذکر میں دلوں کی زندگی رکھی، صبر کو روح کا لباس بنایا، اور جدائی کو محبت اور سچائی کو جانچنے کی کسوٹی ٹھہرایا۔ درود و سلام ہوں اس عظیم ہستی پر جو لوائے حمد کے علمبردار، روزِ قیامت شفاعت فرمانے والے، ہمارے آقا و مولا حضرت محمد ﷺ ہیں؛ جن کا ذکر شفا ہے، جن کی محبت حیا ہے، اور جن کا نور ہدایت کا مینار ہے۔

(اور اُنہیں اللہ کے دنوں کی یاد دلاؤ—ابراہیم، آیت 5)

یہ انہی "ایّامِ اللہ" کی یادوں میں سے ہے کہ انسان کبھی اپنے ماضی کے زخموں پر ہاتھ رکھتا ہے، کبھی ان نعمتوں کو شمار کرتا ہے جو خاموشی سے دل کی ویران کوٹھڑی میں اترتی رہیں۔ زندگی کی یہی ساعتیں، یہی کنجِ تنہائی کے قرطاس پر بکھری ہوئی یادیں، رفتہ رفتہ ایک ایسی داستان میں ڈھلتی ہیں جو صرف فرد کی نہیں، عہد کی بھی گواہی بن جاتی ہے۔ *حدیثِ وصال* اسی رودادِ عمر کا نام ہے۔

بِسْمِ اللهِ الَّذی جَعَلَ الفُراقَ بابًا لِلوَصل،
وَالحُزنَ مِحرابًا لِلمَحَبَّة،
وَالوَقتَ رَیحانَةَ العُمرِ لِمَن تَفَکَّر۔
الحمد للهِ الذی یُبدِّلُ خَوفَ العارفینَ أَمنًا،
وَیَجعَلُ صَمتَ المُحبّین ذِکرًا،
وَدُموعَهُم نُورًا۔

اللہ کے نام سے آغاز کرتا ہوں جس نے جدائی کو وصال کا دروازہ بنایا، غم کو محبت کی محراب قرار دیا، اور وقت کو اہلِ فکر کے لیے عمر کی خوشبو بنا دیا۔ **الحمدُ للّٰہِ** اُس ربِ کریم کے لیے ہے جو عارفوں کے دلوں کے خوف کو امن میں بدل دیتا ہے، محبت کرنے والوں کی خاموشی کو ذکر بنا دیتا ہے، اور اُن کے آنسوؤں کو نور میں ڈھال دیتا ہے۔

صلوٰۃ و سلام اُس ہستی پر جس نے فرمایا:

— **أَنَا مَدِینَةُ العِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُهَا**

جو خود دروازہ بھی تھا، منزل بھی،

بِسْمِ مَنا فَرَّقَ لِیَجمَع،
وَأَوجَدَ لِیُشهِد،
وَأَخفَی لِیُبدِی،
وَجَعَلَ الفِراقَ طَرِیقًا إلی الوِصال۔

اُس ذات کے نام سے جس نے جدا کیا تا کہ (پھر) ملا دے،
اور وجود بخشا تا کہ (اپنی قدرت) دکھائے،
اور چھپایا تا کہ ظاہر کرے،
اور جدائی کو وصال تک پہنچنے کا راستہ بنا دیا۔
حمد اُس نور کے نام
جو ہجر کی رات کو وصال کی سحر میں بدل دیتا ہے؛
جو دل میں چھپا ہو تو درد بن جاتا ہے
اور ظاہر ہو جائے تو محبت۔
درود اُس محبوب پر
جو کہہ گیا:
—"قلبُ المؤمنِ عرشُ الرَّحمٰن"
یعنی دل کا راستہ
خدا کے در تک جاتا ہے،
کوئی موڑ ضائع نہیں ہوتا،
کوئی زخم بے معنی نہیں رہتا۔

یہ چند صفحات، جن میں آپ ایک محزون مگر با معنی سفر حیات کے چراغ دیکھیں گے، دراصل ایک ایسی داخلی تپش کی پیداوار ہیں جسے میں نے برسوں اپنے سینے میں دبائے رکھا۔ یہ *حدیثِ وصال* ایک کتاب نہیں، ایک فریادِ دل ہے؛ ایک ایسی آہِ سرد جو خاموش رہتے رہتے آخر کار لفظوں کا پیرہن اوڑھنے پر مصر ہو گئی۔

—جب دل بولتا ہے اور قلم محض سامع ہوتا ہے
— کبھی کبھی انسان تحریر نہیں لکھتا
تحریر انسان کو لکھتی ہے۔
دل کہتا ہے:

اے مسافرِ فراق
—اپنے زخم چھپا کر مت رکھ
کہ زخم چھپانے سے بھڑکتے ہیں،
"اور کہانی کہنے سے مرہم بنتے ہیں۔
—صوفیہ کے ہاں فراق سزا نہیں
دعوتِ قُرب ہے۔

وہ کہتے ہیں:

"جس کے دل میں ہجر کی آگ جلے، اسے وصال کا در کھلنے ہی والا ہوتا ہے۔"

میری یہ کتاب حدیثِ وصال

اسی ہجر اور اسی نویدِ وصال کی روداد ہے۔

—یہ فراقِ دنیا نہیں، فراقِ دل ہے

اور دل کا فراق، رب کے در تک پہنچانے والی سیڑھی۔

اور سفر کی لَے بھی۔

—یاد کے چراغ اور فراق کے موسم

زندگی کے وسیع صحرا میں کچھ مقامات ایسے ہوتے ہیں جہاں انسان رکتا نہیں—بلکہ ٹھہر جاتا ہے۔

وہاں وقت رک کر انسان کے دل پر دستک دیتا ہے،

اور کہتا ہے:

"اپنے ایامِ رفتہ کو بیان کر، تاکہ تیرے اندر کا بوجھ ہلکا ہو اور تیرے رب کا فضل نمایاں ہو۔"

قرآن کہتا ہے:

﴿وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللَّهِ﴾

۔(اور انہیں اللہ کے دنوں کی یاد دلاؤ—سورۃ ابراہیم)

—میری یہ کتاب حدیثِ وصال دراصل انہی "ایّامِ اللہ" کی روداد ہے

کچھ شکر کے چراغ، کچھ صبر کے قافلے، کچھ فراق کے زخم، کچھ وصل کے انعام۔

یہ تحریر وقت کے ریگزار پر پاؤں کے وہ نشان ہیں

جو لہر آنے تک قائم رہتے ہیں،

اور لہر گزر بھی جائے تو دل میں نقش چھوڑ جاتے ہیں۔

ابتدائیہ

کچھ یادیں ایسی ہوتی ہیں جو وقت کے ساتھ مدھم نہیں ہوتیں، بلکہ جدائی کے بعد اور زیادہ روشن ہو جاتی ہیں۔ کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں جو زندگی کی سانسوں کے ساتھ بندھے رہتے ہیں، اور کچھ وجود ایسے کہ جن کی خاموشی بھی گفتگو بن جاتی ہے۔ جب اللہ ربّ العزّت نے دل پر دستک دی اور قلم کو حرکت عطا فرمائی تو احساس عجز کا سب سے پہلا سوال یہی تھا کہ کیا میں ان یادوں کا حق ادا کر سکوں گا جو دل کے نہاں خانوں میں سانس لیتی ہیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ لفظ، اُس رفاقت کی گہرائی، اُس محبت کی پاکیزگی اور اُس صبر کی وسعت کو سمیٹ سکیں جو ایک نیک بیوی کی زندگی کا سرمایہ ہوتی ہے؟ کیا لفظ اس امانت کا بوجھ اٹھا سکیں گے جو برسوں کی رفاقت، صبر، محبت، ایثار اور دعا سے عبارت ہے؟ یادوں کا یہ سفر آسان نہ تھا، کہ ہر موڑ پر آنکھ نم اور دل بوجھل ہو جاتا تھا، مگر پھر ایک خیال نے ہمت بندھائی۔ یہی یقین قلم کو حرکت دیتا رہا۔

یہ تحریر محض یادوں کا بیان نہیں، بلکہ ایک امانت ہے؛ اور امانت کا حق ادا کرنا ہمیشہ دشوار ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم ہمیں یاد دلاتا ہے:

...إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ(الاحزاب:72)

ہم نے (بار) امانت کو آسمانوں اور زمین پر پیش کیا

سو جب یہ امانت قلم پر آئی تو دل کانپ اٹھا، مگر پھر نیت نے سہارا دیا۔

یہ نیت کہ اگر ایک صالح بیوی کی زندگی کے وہ روشن پہلو تحریر میں آ جائیں جو اس مادّہ پرست دور میں ازدواجی زندگی کی الجھنوں، نفسیاتی تھکن اور روحانی خلا کو کم کر سکیں؛ اگر یہ صفحات میاں بیوی کو باہمی احترام، صبر، شکر اور ایثار کی طرف لوٹا سکیں؛ تو شاید یہ تحریر کسی کے لیے ہدایت، کسی کے لیے نصیحت اور کسی کے لیے امید کی کرن بن جائے۔

یہ خیال کہ اگر ایک نیک، صالح اور وفادار بیوی کی زندگی کے وہ پہلو تحریر میں آ جائیں جو اس مادّی دور میں ازدواجی زندگی کے بکھرتے رشتوں کو سہارا دے سکیں، زندگی کی الجھنوں، نفسیاتی تھکن اور روحانی خلا کو کم کر سکیں؛ کسی ٹوٹتے دل کے لیے تسکین، کسی بگڑتے گھر کے لیے روشنی اور کسی آزمائش میں مبتلا جوڑے کے لیے امید بن جائے۔ اگر یہ صفحات میاں بیوی کو باہمی احترام، صبر، شکر اور ایثار کی طرف لوٹا سکیں؛ تو شاید یہ تحریر کسی کے لیے ہدایت، کسی کے لیے نصیحت اور کسی کے لیے امید کی کرن بن جائے۔ شاید یہ تحریر یہی وہ نیت ہے جس نے قلم کو رواں کیا اور اسی نیت پر یہ عاجزانہ کوشش اللہ کے حضور پیش ہے، کہ وہ اسے ہم دونوں میاں بیوی کے لیے زادِ آخرت بنا دے۔ آمین

اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے

فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ، وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ، فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ(الیل:5-7)

تو جس نے ﴿راہِ خدا میں﴾ مال دیا اور ﴿خدا کی نافرمانی سے﴾ پرہیز کیا، اور بھلائی کو سچ مانا تو ہم اس کے لیے جنت کی راہیں آسان کر دیں گے۔

برادرم وحید شریف صاحب کے مخلصانہ مشورے نے اس تحریر کو سمت عطا کی کہ اگر اس کتاب کا آغاز امہات المؤمنین رضی اللہ عنہما کے تذکرے سے کیا جائے تو یہ بابرکت ہو گا اور میرے دل نے بھی فوری گواہی دی کہ کہ واقعی اگر اس کتاب کا آغاز امہات المؤمنین رضی اللہ عنہما کے مبارک ذکر سے کیا جائے تو یہ محض ادبی حسن نہیں بلکہ روحانی نسبت بھی ہو گی۔ امہات المؤمنین وہ ہستیاں ہیں جنہیں قرآن نے أُمَّهَاتُهُمْ کہہ کر ایمان والوں کی مائیں قرار دیا(الاحزاب:6)

ان کی زندگیاں صبر، وفا، قناعت، غیرتِ ایمانی اور گھریلو حکمت کا ایسا جامع نمونہ ہیں جو ہر دور کے لیے رہنمائی رکھتا ہے بلکہ اس نسبت کو بھی اجاگر کرے گا جو میری اہلیہ، ثمینہ، نے اپنی زندگی میں شعوری طور پر قائم رکھنے کی کوشش کی۔ اس کی ساری زندگی اسی جدوجہد کی عکاس رہی کہ امہات المؤمنین کے اسوۂ حسنہ کو اپنا آئیڈیل بنا کر گھر کو سکون، پاکیزگی، صبر، شکر اور محبت کا گہوارہ بنایا جائے۔

میری اہلیہ، ثمینہؒ — نے اپنی بساط کے مطابق یہی کوشش کی کہ امہات المؤمنین کے اسوۂ حسنہ کو اپنا معیار بنائیں۔ وہ جانتی تھیں کہ سکونِ قلب کا تعلق ظاہری آسائش سے نہیں بلکہ نیت کی صفائی، کردار کی مضبوطی اور اللہ پر توکل سے ہے۔ اس نے گھر کو محض رہائش گاہ نہیں بلکہ عبادت، ذکر اور محبت کا مرکز بنایا۔ قرآن جس کا ذکر کرتا ہے:

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً(الروم:21)

اور اسی کے نشانات (اور تصرفات) میں سے ہے کہ اُس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس کی عورتیں پیدا کیں تاکہ اُن کی طرف (مائل ہو کر) آرام حاصل کرو اور تم میں محبت اور مہربانی پیدا کر دی۔

نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے

إِذَا مَاتَ ابْنُ آدَمَ انْقَطَعَ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ: صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ.(مسلم)

جب کوئی شخص مر جاتا ہے تو اس کے تمام اعمال ختم ہو جاتے ہیں سوائے تین کے: جاری صدقہ، علم جس سے فائدہ اٹھایا جائے، یا نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرے (مسلم)۔

یقیناً ثمینہ اپنے پیچھے صبر کی خوشبو، دعا کی حرارت اور کردار کی روشنی چھوڑ گئی ہے۔ اس سکون کی عملی تصویر اس کی زندگی میں نظر آتی تھی۔ وہ اپنے کردار کے ایسے روشن نقوش ہماری یادوں میں چھوڑ گئی جو یقیناً اس کے لیے صدقۂ جاریہ، زادِ راہ اور مغفرت کا ذریعہ ہوں گے، ان شاء اللہ۔

اس کی خاموش قربانیاں، اس کا استقامت بھرا صبر، اس کی عبادت میں اخلاص اور رشتوں میں سچائی — یہ سب وہ اثاثہ ہے جو وقت کی گرد میں بھی ماند نہیں پڑ سکتا۔

یہ تحریر اسی امید کے ساتھ لکھی جا رہی ہے کہ شاید یہ یادیں اس کے لیے علمِ نافع، اور اس کے لیے جاری صدقہ بن جائیں، اور پڑھنے والوں کی دعائیں اس کے نامۂ اعمال کو روشن کر دیں۔

یہ کتاب "حدیثِ وصال" دراصل جدائی کی کہانی نہیں، بلکہ وفا کی روایت ہے؛ یہ غم کا مرثیہ نہیں بلکہ شکر کا بیان ہے؛ یہ اختتام نہیں بلکہ اس رفاقت کا تسلسل ہے جو دنیا سے آخرت تک پھیلا ہوا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

الدُّنْيَا مَتَاعٌ، وَخَيْرُ مَتَاعِهَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ (مسلم)

دنیا ایک عارضی لذت ہے اور اس کی بہترین لذتوں میں نیک عورت ہے۔

اسی نسبت، اسی امید اور اسی دعا کے ساتھ میں "حدیثِ وصال" کا آغاز امہات المؤمنین کے مبارک ذکر سے کرنے کی جسارت کر رہا ہوں، کہ شاید یہ تحریر قبولیت کی دہلیز تک پہنچ جائے، اور پڑھنے والوں کے دلوں میں محبت، وفا اور رضا بالقضاء کا چراغ روشن کر دے اور اللہ تعالیٰ اس عاجزانہ کوشش کو

قبول فرمائے، اس میں اخلاص پیدا کرے، اور اسے ہم دونوں کے لیے مغفرت، بلندئ درجات اور قربِ الٰہی کا ذریعہ بنادے۔
یااللہ! اس کوشش کو اپنی رضا کے لیے قبول فرما، اس میں خیر، برکت اور ہدایت رکھ دے، اور اسے ہم دونوں کے لیے نجات اور قربِ الٰہی کا وسیلہ بنا دے، جو لکھا گیا وہ تیری رضا کے لیے ہو، جو باقی رہ جائے وہ تیری رحمت سے پورا ہو، اور اس تحریر کو ہمارے لیے حجت نہیں بلکہ شفاعت بنادے۔
آمین یارب العالمین۔

اگر یہ صفحات اس حقیقت کو ایک بار پھر زندہ کر سکیں تو یہی اس تحریر کی سب سے بڑی کامیابی ہو گی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حروفِ مہرباں

یدِ بیضا کے معجزے

حافظ محمد طاہر

الحمدللہ، سمیع اللہ ملک کی تصنیف خاک وخوں کے بعد **حدیثِ وصال** پر لکھی گئی یہ میری دوسری تحریر ہے۔ **حدیثِ وصال** کی کہانی ان کی رفیقۂ حیات ثمینہ سمیع کے گرد گھومتی ہے۔ یہاں بھی میرے لیے اس سے بڑی سعادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ سلسلہ، جو طویل عرصے تک رکا رہا، آٹھ سال کے تعطل کے بعد ان کے ذہن کے پردے پر اُس وقت اُبھرا جب وہ میری درخواست پر اقبال عالمی کانفرنس کے لیے کوئٹہ تشریف لائے۔ سمیع اللہ ملک ،ایک پختہ کار اور جہاں شناس شخص ہیں جو اپنے غم و حزن کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ غم ان کے ہاں تخلیقی قوت کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ یہ غم نہ ختم ہونے والا ہے، مگر انہوں نے اسے عزیز رکھ لیا ہے اور اس کے ساتھ سلیقے سے نبھانے کا فن بھی سیکھ لیا ہے۔ ایک درویش کا کام اپنی ذات میں گم ہو جانا ہوتا ہے، جہاں بے بسی بھی ایک باوقار طمانیت اور مجذوبانہ کیفیت میں ڈھل جاتی ہے۔ وہ صاحبِ مقصد شخص ہے، برداشت اس کی فطرت میں شامل ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ توانائی اور بلند حوصلگی بھی اس کی شخصیت میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے وہ خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ حدیثِ وصال محض ایک کتاب نہیں، بلکہ دل کی فریاد ہے، ایک ایسی آہِ سوز جو خاموشی کے پردے میں الفاظ کا پیرہن اوڑھ لیتی ہے۔ کیونکہ جب دل بولتا ہے تو قلم محض سامع بن جاتا ہے۔ کبھی انسان تحریر نہیں لکھتا، بلکہ تحریر انسان کو لکھتی ہے۔

کانفرنس کے فیض سے وہ قرض، جو برسوں سے ان کے دل پر بوجھ بنا ہوا تھا، ادا ہونے لگا۔ پچاس برسوں سے لکھنے والا ایک پختہ کار لکھاری، جس کی ستر کتب منظرِ عام پر آ گئیں ہوں مگر وہ اپنی اہلیہ ثمینہ سمیع کے بارے میں ایک سطر بھی نہ لکھ سکے تھے۔ یہاں آ کر، خدا کے حکم سے، انہوں نے اس تحریر کا آغاز کیا اور یوں حدیثِ وصال نے جنم لیا۔ میری یہ دلیل بھی کارآمد ثابت ہوئی جب میں نے انہیں کہا کہ اللہ جانے کتنی بیٹیاں، بہنیں اور خواتین ایسے تجربات سے رہنمائی حاصل کریں گی۔ وہ مجھے مربی کہتے ہیں کہ حافظ طاہر میرے لیے محبتِ ربانی کا اشارہ ہے، اور صوفیہ کے نزدیک خدا اپنے بندوں کی محبت کو اپنی نشانیوں میں شامل کر لیتا ہے، اور میرے اسرار و تجربات نے کتاب کی ضخامت کو معنی عطا کر دیا۔ انہوں نے میری ہی تجویز پر حدیثِ فراق سے اس کا نام حدیثِ وصال رکھا۔

انسانی زندگی دراصل دو صداؤں کے درمیان کا ایک وقفہ ہے۔ ایک صدا وہ ہے جو عالمِ ارواح میں سنائی دی، جب روحوں نے پکار پر لبیک کہا، اور دوسری صدا وہ ہے جو ایک دن ہمیں اپنی طرف بلائے گی۔ ایک خوب صورت، ابدی اور سرمدی ندا، جس کا انتظار خود زندگی ہے۔ اِن دو صداؤں کے درمیان جو مہلت عطا کی گئی ہے، اُسی کو حیاتِ دنیا اور اس کے بعد حیاتِ برزخ کہا جاتا ہے۔ یہ اللہ کے مقرر کردہ نظام کا حصہ ہے، ایک طے شدہ وقفہ، جسے یوں سمجھا جا سکتا ہے جیسے ازل اور ابد کے درمیان دیا گیا ایک ضروری "وقفۂ عمل"۔ یہ وقفہ بہ ظاہر طویل محسوس ہوتا ہے، مگر حقیقت میں یہ چند ساعتوں سے زیادہ نہیں۔ قرآنِ کریم اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسان قیامت کے دن سمجھے گا کہ وہ دنیا میں ایک دن یا اس سے بھی کم وقت ٹھہرا تھا۔ جو لوگ نیک اعمال کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں، ان کے لیے یہ مہلت محض ایک مختصر قیام ثابت ہوتی ہے۔ ایک ایسا سفر جو فراق سے شروع ہو

کر وصال پر ختم ہوتا ہے۔

قرآنی تصور کے مطابق، ان دو صداؤں کے درمیان کا یہ وقفہ دراصل وصالِ اول سے وصالِ آخر تک کا سفر ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جس میں انسان کو اختیار دیا گیا کہ وہ اپنی ابدی منزل کا تعین خود کرے۔ یہ اللہ کے نظامِ وقت میں ایک ناگزیر مرحلہ ہے، جس کے بغیر ابدی حیات کا تصور مکمل نہیں ہوتا۔ حیاتِ دنیا اور حیاتِ برزخ، حقیقت میں، اسی ایک صدا کے انتظار کا نام ہیں۔ ہم اس زندگی کو اس لیے جیتے ہیں کہ ایک دن وہ آخری ندا سن سکیں جو ہمیں دائمی قرب، ابدی سکون اور حقیقی ملن کی طرف بلائے گی۔ جو دل اس صدا کے احترام میں دھڑکتے ہیں، جو روحیں اس کے لیے خود کو تیار کرتی ہیں، وہی اصل میں اس زندگی کا مقصد پا لیتی ہیں۔

یوں انسانی زندگی فراق سے وصال تک کا ایک بامعنی سفر ہے۔ ایک ایسی مہلت جس میں ہر لمحہ ہمیں اس ابدی آواز کے قریب لے جا رہا ہے، جس کا سننا ہی اصل حیات ہے۔
"يَا عِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَا أَنتُمْ تَحْزَنُونَ ﴿٦٨﴾ الَّذِينَ آمَنُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا مُسْلِمِينَ ﴿٦٩﴾ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ أَنتُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُونَ ﴿٧٠﴾ يُطَافُ عَلَيْهِم بِصِحَافٍ مِّن ذَهَبٍ وَأَكْوَابٍ ۖ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ ۖ وَأَنتُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٧١﴾" سورہ الزخرف (آیات 68-71)

اِن آیات میں قیامت کے دن اہلِ ایمان کے لیے تسلی، تکریم اور دائمی کامیابی کا محبت بھرا اعلان ہے۔ اُس دن نہ کوئی خوف باقی رہے گا اور نہ کسی غم کی گنجائش ہو گی، حالانکہ یہی دو کیفیات انسانی نفسیات پر سب سے زیادہ حاوی رہتی ہیں۔ قرآنِ کریم جنت کی سب سے پہلی نعمت یہی بیان کرتا ہے کہ وہاں دل کا اضطراب، مستقبل کا اندیشہ اور ماضی کا افسوس ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے گا، اور انسان کامل اطمینانِ قلب سے ہم کنار ہو گا۔ یہ بشارت محض ایک دعویٰ نہیں بلکہ ایمانِ قلبی اور عملی اطاعت کے ساتھ مشروط ہے۔ دل کا یقین اور زندگی کا عمل جب ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں تو انسان اس وعدۂ الٰہی کا مستحق بنتا ہے۔ اسی لیے جنت تنہائی کی جگہ نہیں بلکہ محبت، رفاقت اور تعلق کی جگہ ہے، کہ تم اور تمہارے جوڑے اس میں داخل کیے جاؤ گے۔ وہاں خوشی اکیلے نہیں برتی جاتی بلکہ بانٹی جاتی ہے، اور یہی اشتراکِ مسرت جنت کی فضا کو مزید دل کش بنا دیتا ہے۔ جنت میں سونے کے برتن، جام، دل کی خواہشات اور آنکھوں کی لذتیں محض مادی نعمتوں کا بیان نہیں بلکہ حسنِ ذوق اور جمال کی تکمیل کا استعارہ ہیں۔ اس کے ذریعے یہ واضح کیا جاتا ہے کہ وہاں انسان کی جسمانی، ذہنی اور روحانی، ہر طرح کی پاکیزہ خواہش پوری کی جائے گی۔ پھر سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ انسان کو اعلان کر دیا جائے گا کہ تم ہمیشہ اسی میں رہو گے؛ نہ زوال کا کوئی خوف ہو گا، نہ جدائی کا اندیشہ، اور نہ نعمت کے چھن جانے کا کوئی خدشہ باقی رہے گا۔

یوں یہ آیات انسان کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتی ہیں کہ اگر وہ دنیا میں ایمان، اطاعت اور صبر کا راستہ اختیار کرے تو اس کے بدلے اسے ایسی ابدی زندگی عطا کی جائے گی جہاں سکون بھی ہے، خوشی بھی، جمال بھی اور دوام بھی، ایک ایسی زندگی جو فنا کے ہر تصور سے ماورا ہے۔

سمیع اللہ ملک، حدیثِ وصال میں متعدد مرتبہ، اپنی اہلیہ کو رفیقِ روح کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اور یہی تعبیر اس حقیقت کو آشکار کرتی ہے کہ وصال محض جسمانی موجودگی کا نام نہیں بلکہ روحانی تسلسل کا اظہار ہے۔ اللہ تعالیٰ جب اِرادہ کرتے ہیں تو اس کے اسباب خود بہ خود بنتے جاتے ہیں۔ اس فکری اور روحانی پس منظر میں اقبال کانفرنس ان کے باطن میں موجود وہ روحانی روشنی بن گئی، جس نے باطنی شکستگی کو آہنگ کو از سرِ نو جوڑنے کا کام کیا۔ یہ ایک ایسا لمحہ تھا جہاں فراق کی تھکن تحلیل ہوئی اور وصال کے امکان نے دل کو نئی سمت عطا کی۔ فکرِ اقبال کی بازگشت نے ان کی خودی کی تعبیر سے زندگی کے سفر مین ایک نیا ربط پیدا کیا۔ میرے لیے اس سے بڑی طمانیت اور کیا ہو سکتی ہے؟ یہ کتاب ایک طرح سے ان کی ڈائری ہے جس کے توسط

سے انہوں نے ثمینہ سمیع کی شخصیت کو مرکز بنایا جو سماجی مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیح دیتی ہے جو نہ صرف انسانیت، بلکہ ہر جاندار کی محبت سے سرشار ہو کر شجر انسانیت کی سوکھی جڑوں کو اپنے خونِ جگر سے سیراب کرتی ہے۔

روزمرہ زندگی میں اپنے سماجی معاملات اور رسومات کو نہایت سلیقے سے انجام دیتی ہے سماج کے ایک باشعور فرد کی حیثیت سے وہ اپنی داخلی دنیا اور خارجی تجربات کو شعوری طور پر برتتی ہے۔ انہی تجربات کی روشنی میں اپنے رد عمل کا اظہار کرتی ہے۔ زندگی کے یہ تمام چھوٹے چھوٹے تجربات جب باہم ملتے ہیں تو ایک عظیم اور ہمہ گیر تجربے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس عمل کے ذریعے اس کی ہمہ گیری سامنے آتی ہے۔ وہ زندگی کے منفی اور کھٹن رویوں کے سامنے متانت اور صبر کے ساتھ نبرد آزما نظر آتی ہے۔ وہ چاہیے گھر کے عقب میں واقع باغ میں پرانے درختوں سے بھرپور اظہارِ محبت ہو یا پھر پرندوں سے اس کی والہانہ اپنائیت، ہر ایک سطح پر اس کے تھکے ماندے اعصاب کے لیے باعث طمانیت ٹھہرتا ہے۔ تاکید کی جاتی ہے مومن جو اپنے لیے پسند کرے وہی اپنے دوسرے بھائیوں کے لیے بھی، مگر وہ تو پرندوں کے معاملے میں بھی احتیاط پسند ہے۔ گہری رفاقت اور قربت کے مظہر پرندے انہی روحانی کیفیات سے سرشار ہو کر منزل کی شناسائی کروانے میں مدد و معاون ہوتے ہیں۔ جذب و انجذاب کا یہ عمل تو قلبی وابستگی سے سرشار ہے، جس سے ایسا تپاک پیدا ہوتا ہے جس کی حرارت سے اس کی نسلیں بھی گم شدہ منزلیں تلاش کر سکتی ہیں۔ اس کے اعمال کی یہ کڑیاں ناقابل فہم معلوم ہوتی ہیں۔ جن کے زیر اثر تحیر، سوال اور تجسس کی فضا گہری ہوتی ہے۔ یہ فضا عام نگاہ کے لیے محیر العقول واقعات یا سربستہ رازوں کی مترادف ٹھہرتی ہے مگر اس کا ادراک تو کوئی صاحبِ نظر ہی کر سکتا ہے۔

اسلام میں عورت کو جو مقام حاصل ہے شاید ہی کسی اور مذہب میں ایسی عزت و تکریم دی جاتی ہو مگر مغربی طرزِ احساس سے نے عمومی طور پر مشرقی خواتین میں بھی اخلاقی ضابطوں کو مسمار کرنے کے رجحان کو فروغ دیا۔ ان منفی رجحانات کے تناظر میں بسا اوقات اسلامی شعار کو بھی مسخ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایسے ہی افکار کی حامل برطانوی رکن پارلیمنٹ "روپا" جب یہ سوال اُٹھاتی ہے کہ تمہارے معاشرے میں عورت مرد کے پیچھے کیوں چلتی ہے؟ اس اعتراض کے جواب میں طویل مباحثے سے قطع نظر ایک سادہ بامعنی، مدلل مثال ہی کافی ٹھہرتی ہے کہ "کیا تم نے ٹی وی پر اپنی ملکہ کو نہیں دیکھا؟ وہ ہمیشہ اپنے گارڈ کے پیچھے چلتی ہے۔ یہ مثال نہ صرف سوال کی سطحیت کو عیاں کرتی ہے، بلکہ تحفظ، عزت، اعتماد، وقار اور ذمہ داری کے اس تصور کو بھی عام کرتی ہے جو اسلامی اقدار و روایات کی بنیاد ہیں۔

ثمینہ سمیع کا کمال یہ ہے کہ وہ کسی بھی اخلاقی اور مذہبی ضابطے کی خلاف ورزی پر کمربستہ قوانین کے خلاف ڈٹ کر کھڑی ہوتی ہے۔ بغیر کسی سے مرعوب ہوئے معاشرتی قدغنوں کا مقابلہ کر کے دنیا بدلنے میں کامیاب ٹھہرتی ہے۔ وہ چاہیے مسلم خواتین کے پردے پر پابندی کی تحریک ہو یا پھر کسی ملک کی غلط پالیسی، اس کے وجود کے اندر کی کرشمہ سازی مثبت تبدیلی سے نئی منزلوں کو طے کرتی ہے۔ یہ کرشمہ سازی کسی ایک مقام پر رک کر منجمد نہیں ہوتی بلکہ عرفان ذات کی سرمستی سے رواں دواں رہتی ہے۔ ہمہ وقت نئی منزلوں کی متلاشی رہتی ہے۔

اقبال نے اپنی شاعری کے توسط سے عورت کی انفرادیت اور خالص مشرقیت کو برقرار رکھنے کی تلقین کی اور ساتھ ہی یہ پیغام بھی دیا کہ اگر عورت سیدہ فاطمہ الزہر رضی اللہ عنہا کے نقشِ قدم پر چلے گی تو ہی حسینؑ کو جنم دے سکے گی۔ حدیثِ وصال کے توسط سے ثمینہ سمیع کی دعائیہ بازگشت سماعت سے ٹکراتی ہے کہ: "میری تمنا بس اتنی ہے کہ قیامت کے دن میں سیدہ فاطمہ الزہر رضی اللہ عنہا کی صف میں کھڑی ہو جاؤں" سمیع اللہ ملک اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ ایک ایسی مثالی مشرقی عورت کا عکس ہے جو آج کی خواتین کے لیے مشعلِ راہ بن سکتی ہے۔ اپنی اس سرگزشت میں انہوں نے

ثمینہ سمیع کی فطری صلاحیتوں، محبت، شفقت، ہم دردی، خلوص، وفا شعاری، شرم و حیا، خدمت، رحم دلی، مروت، فرماں برداری پر روشنی ڈال کر اس کی مکمل شخصیت کی تصویر کھینچی ہے۔

سمیع اللہ ملک اور ثمینہ سمیع کے سامنے عیش و عشرت، رنگ و بو اور کیف و انبساط میں ڈوبا ہوا مغربی معاشرہ تھا، مگر وہ دونوں توکل، استغنا، ایثار اور انکساری کے راستے پر چلتے رہے۔ دنیا کی جاہ و حشمت اور مغرب کی چکاچوند زندگی انہیں مرعوب نہ کر سکے، کیونکہ جسے درویشی کی دولت حاصل ہو جائے تو پھر کسی دوسری دولت کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ اس درویشی کو روحانیت قوتِ استحکام بخشتی ہے۔ دعا ہے کہ سمیع اللہ ملک کی یہ کاوش امتِ مسلمہ کی ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کی رہ نمائی میں اپنا وہ پُر خلوص کردار ادا کر سکے جس خلوص سے یہ کاوش تخلیق کی گئی ہے۔

(امین)

حافظ طاہر احمد

سابق سیکرٹری ہائر ٹیکنیکل ایجوکیشن صوبہ بلوچستان

حالیہ او ایس ڈی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دلوں کا وہ وصل جو خدا سے جڑا رہا

محترم جناب سمیع اللہ ملک سے چند روز پہلے، بین الاقوامی کانفرنس کوئٹہ میں ملاقات محض اتفاق سے ہوئی۔ اس سے پہلے میں ان کے نام نامی سے واقف تھی نہ ان کے علمی و عملی کمالات سے آگاہ تھی۔ کانفرنس کے بروشر پر ہی پہلی بار ان کا نام دیکھا تھا۔ کانفرنس سے ایک دن پہلے جب وہ تشریف لائے تو حاضرین محفل کو اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کا والہانہ استقبال کرتے دیکھا۔ اتفاق سے تب میں بھی وہیں موجود تھی اور مجھے احساس ہوا کہ وہ کوئی اہم شخصیت ہیں جن کا سبھی احترام کرتے ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ کیا واقعی یہ ملاقات محض اتفاقی تھی۔ عارفانِ حقیقت اس بات پر متفق ہیں کہ دنیا میں کوئی بات بھی اتفاق سے وقوع پذیر نہیں ہوتی۔ ہر بات، ہر چیز، ہر واقعہ، کائنات کے ایک بڑے نقشے کی طے شدہ ترتیب کے مطابق اپنے مخصوص وقت اور مقام پر رونما ہوتا ہے اور اس نقشے کی تکمیل کا سبب بنتا ہے۔ اس خیال سے اختلاف کرنے والے بھی اپنی دلیلیں لاتے ہیں۔ انسانی عقل اور علت و معلول کے رشتوں پر توجہ دیں تو ان کی دلیلوں میں بہت وزن ہے مگر انسانی تجربات بھی بہت اہم ہوتے ہیں۔ جب کوئی تجربہ رونما ہو رہا ہو، تو اس کے عواقب پر نظر نہیں پڑ سکتی لیکن بہت دیر بعد، جب انسان پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے تو جگ ساپزل کی طرح ٹوٹے پھوٹے، کٹے پھٹے، بے ترتیب ٹکڑے جڑ کر ایک بڑی تصویر کا حصہ بنے نظر آتے ہیں۔ ایسا حصہ جس کے بغیر تصویر مکمل ہی نہیں ہو سکتی تھی۔

تو جناب سمیع اللہ ملک سے یہ اتفاقی ملاقات، اتفاقات کے ایک سلسلے کو جنم دیتی نظر آئی۔ پہلے روز ہی جب وہ افتتاحی اجلاس میں اپنے روح پرور خطاب کے بعد سٹیج سے نیچے اترے تو میں نے آگے بڑھ کر ان سے عرض کی کہ انھیں دیکھ کر مجھے اپنی ایک محترم و عزیز ہستی ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری یاد آ گئے ہیں۔ میری بات نے انھیں اپنے محسن و ممدوح اور ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری کے والد محترم مولانا ظفر احمد انصاری کی یاد دلا دی۔ اس پر وہ اتنے خوش ہوئے کہ انھوں نے مجھے اپنے دامن شفقت میں مستقل جگہ اور اپنی چھوٹی بہن کا مرتبہ عطا کر دیا۔ اگلے روز ناشتے کے دوران میں ایک اور محترم و با کمال شخصیت جناب ڈاکٹر رمضان طاہر نے انکشاف کیا کہ آنجناب قدرت اللہ شہاب صاحب کے قریبی عزیز ہیں۔ یہ ایک اور رشتہ تھا جو محض حسن اتفاق سے بے نقاب ہو گیا تھا۔ کوئٹہ میں قیام کے دوران جناب سمیع اللہ ملک صاحب نے کشمیر اور اہل کشمیر کا ذکر اتنی بار اور اتنی دردمندی سے کیا کہ مجھے لگا کہ کشمیر کا رشتہ بھی ہمارے درمیان مشترک ہے۔ میرے آباؤ اجداد بھی تو کشمیر ہی سے ہجرت کر کے امرتسر آباد ہوئے تھے۔ خدا جانے انسان کا اصل وطن کون سا ہوتا ہے مگر وطن میں کوئی اسرار تو ضرور ہوتا ہے جو انسان کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

بہر حال یہ اتفاقی ملاقات ایک پر خلوص تعلق میں تبدیل ہوتی نظر آئی۔ اس تعلق کی ایک اور گرہ اس وقت مضبوط ہوئی جب انھوں نے اپنی والدہ محترمہ اور والد گرامی کی یاد میں لکھے ہوئے خاکہ نما مضامین ارسال کیے۔ انھیں پڑھ کر معلوم ہوا کہ انھوں نے کس قدر مختلف ماحول میں تربیت پائی ہے۔ یہاں مختلف سے میری مراد ہے ہمارے معاشرے میں عام طور پر نظر آنے والے، یہاں تک کہ خود میرے اپنے ماحول سے مختلف۔

اس پر مستزاد یہ کہ کچھ ہی دن بعد انھوں نے اپنی مرحومہ بیگم ثمینہ سمیع کے بارے میں لکھے ہوئے مختصر شذرے ارسال کرنا شروع کیے۔ یہ شذرے انھوں نے کوئٹہ ہی کی ڈاکٹر قندیل بدر کی فرمائش پر لکھے تھے جو ان کے لیے بیٹی کا درجہ اختیار کر گئی تھیں۔ یہ شذرے پڑھ کر میں نے ان سے

درخواست کی کہ وہ یہ بھی تحریر فرمائیں کہ اس ساری صورت حال کا محرک و پس منظر کیا تھا؟ آخر وہ کیا شے تھی جس نے ثمینہ سمیع کو ثمینہ سمیع بنا دیا۔ وہ کن دریاؤں کا پانی، کن شہروں کی مٹی تھی جس نے ایسے سایہ دار اور ثمر بار شجر کی آبیاری کی۔ تاکہ ہمیں معلوم ہو سکے کہ ایسے کردار جس سانچے میں ڈھلتے ہیں، وہ سانچے اب کہاں ملتے ہیں۔ میری درخواست کو بھی انھوں نے پذیرائی بخشی اور یوں یہ شذرات مجتمع ہو کر اس کتاب کی صورت اختیار کر گئے۔

ان شذرات کے مطالعے نے مجھے کئی سطحوں پر متاثر اور حیران کیا۔ سب سے پہلے تو یہ بات انوکھی لگی کہ ایک شوہر نے اپنی بیوی کے لیے اپنے جذبات کا برملا اظہار کیا اور اس سے بڑھ کر یہ بات کہ ان جذبات کا دارومدار صرف محبت اور شکر گزاری پر نہیں بلکہ ان پر عزت و احترام اور عقیدت و تقدیس کا احساس غالب ہے۔ انھوں نے بار بار اس بات کا ذکر کیا ہے کہ مشرقی روایات کا تقاضا ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے سے محبت کا اظہار عمل اور خدمت سے کریں، الفاظ اور تحریر سے نہیں اور یہی وجہ ہے کہ انھیں آٹھ برس تک اپنی وفاشعار بیوی کے بارے میں کچھ لکھنے میں جھجک محسوس ہوتی رہی۔ لیکن ان کے الفاظ میں اپنی مرحومہ بیوی کے لیے جیسی عقیدت اور جیسا احترام جھلک رہا ہے وہ مشرقی روایت کے تقاضوں سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ان کے جذبِ دل کی تاثیر ایک ایک لفظ میں چھلک رہی ہے اور باہمی رفاقت، اعتماد، بھروسے اور خلوص کی شیرینی ایک ایک سطر سے ٹپک رہی ہے۔

ہمارے گردوپیش کی معاشرتی صورت حال میں، جہاں بیوی کو لطیفوں اور طنزیہ، مزاحیہ اور استہزائیہ جملوں کا نشانہ بنانا ایک عام اور مقبول سماجی رویہ بن چکا ہے بلکہ اسے شوہرانہ استحقاق کی مسلمہ نشانی سمجھا جاتا ہے، بیوی کے لیے عزت و احترام کے جذبات کا اظہار واقعی ایک غیر معمولی عمل دکھائی دیتا ہے۔

اس کتاب کی دوسری نہایت اہم جہت یہ ہے کہ اس میں ایک مثالی مسلمان گھرانے کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ ایسا گھرانہ جیسا اسلامی شعائر کے مطابق ہونا چاہیے، ایسا نہیں جیسا عام طور پر ہمارے ہاں ہوتا ہے۔ اس گھرانے کے افراد ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں، ایک دوسرے کے رازدار ہیں، اور ایک دوسرے کے سچے رفیق اور مخلص دوست ہیں۔ مگر خاص بات یہ ہے کہ ان سب رشتوں اور رویوں کے پس پشت جو محرک کام کر رہا ہے وہ کسی دنیاوی یا ذاتی خواہش پر مبنی نہیں بلکہ اس کی بنیاد اطاعت الٰہی ہے۔ ان کے ہر عمل کا محرک اصول دین کی پاس داری ہے اور یہی وہ محور ہے جس پر انسانی تعلقات سے لے کر سماجی اعمال و افعال تک، ہر چیز گردش کر رہی ہے۔ میاں بیوی کے درمیان محبت ہو یا انسانوں اور پرندوں کے درمیان رشتہ، عالمِ انسانیت کی بے لوث خدمت ہو یا عالم فطرت سے گہرا جذباتی تعلق، ہر احساس کے عقب میں ایک ہی جذبہ کار فرما ہے؛ اپنے خالق کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کی خواہش اور نیت۔ اس ایک جذبے اور نیت نے ان کے ہر عمل کو عبادت کا رنگ دے دیا ہے اور اس میں تقدیس پیدا کر دی ہے۔

جدید طرز زندگی نے مسلمان معاشروں سے سب سے بڑی جو دولت چھین لی ہے وہ یہی جہت ہے۔ روایتی مسلمان معاشرے میں معیارِ عظمت و بزرگی یہی تھا کہ کوئی انسان اپنے خالق، اپنی رب کی رضاجوئی کے لیے کس حد تک کوشاں رہا۔ انسانی تگ و دو کا بنیادی مقصد یہی سمجھا جاتا تھا۔ اس سے انحراف کی راہیں بھی موجود تھیں، انسان اس معیار تک پہنچنے میں ناکام بھی رہتے تھے، خطاکار و گنہ گار بھی ہوتے تھے لیکن اجتماعی مقصد حیات اسی کو سمجھتے تھے ۔ جدید طرز زندگی نے اس بنیادی مقصد پر ضرب لگائی اور انسان کو فوری نوعیت کے، نسبتاً آسانی سے حاصل ہو جانے والے مقاصد کا عادی بنا دیا۔ اب انسان کا بنیادی مقصد اس دنیاوی زندگی کو آسان اور پر تعیش بنانے تک محدود ہو گیا اور اس سے آگے بڑھ کر خالق سے نسبت یا تعلق قائم کرنے اور اس کی رضا حاصل کرنے کا مقصد یا تو بالکل غائب ہو گیا یا اگر روایتی طور پر باقی بھی رہا تو محض کتابی یا نصابی حد تک۔ عملی زندگی میں اس مقصد کی حیثیت ضمنی

ہو گئی۔ اس طرزِ فکر کے نتیجے میں ہر عمل اور ہر کوشش کی اہمیت اس کے فوری یا دنیاوی نتائج سے مشروط ہو گئی۔ یوں انسانی عمل کی رینج یا اس کا دائرہ کار مختصر ہونے لگا۔ فوری فائدہ یا فوری نتیجہ اس کی بنیادی شرط بن گیا اور طویل المدت نتائج نہ صرف نظر سے اوجھل ہو گئے بلکہ غیر متعلق اور غیر ضروری بھی محسوس ہونے لگے۔

جدید طرزِ زندگی میں اس سوچ کے اثرات انفرادی اور معاشرتی زندگی کے ہر پہلو پر نظر آتے ہیں لیکن خاص طور پر عائلی زندگی یا میاں بیوی کے درمیان تعلق اس سے متاثر ہوا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس تعلق کو ایک طویل المدت فلاح کا راستہ سمجھنے کے بجائے فوری ملنے والی خوشی اور مفادات کا ذریعہ سمجھا جانے لگا ہے جس کے نتیجے میں جدید معاشرے میں یہ رشتہ کمزور ہوتا جا رہا ہے۔

ایک اور بات جس کا اظہار ضروری ہے یہ ہے کہ اس رشتے میں بالعموم شوہر کا پلڑا بھاری ہو گیا ہے کیوں کہ وہ پیداواری ذرائع کا مالک ہے۔ بیوی اگر معاشی اعتبار سے مرد پر انحصار کرتی ہے تو اس کا استحصال آسان بھی ہے اور عام بھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر طبقے میں مرد پر انحصار کرنے والی عورت کی مظلومیت بڑھتی جا رہی ہے۔ بیوی ہونے کی حیثیت سے اس کا احترام نہ ہونے کے برابر ہے۔ دوسری طرف اگر وہ معاشی حیثیت سے مضبوط ہے تو بھی اس کا احترام اس کے معاشی طور پر مفید ہونے سے وابستہ ہو گیا ہے۔ جب تک وہ معاشی فائدے کا باعث ہے، تب تک اس کی اہمیت باقی ہے، جونہی معاشی فائدہ منقطع ہوتا ہے، وہ عضو معطل ہو جاتی ہے۔

دراصل میاں بیوی کا تعلق دو انسانوں کے درمیان قائم ہونے والا طویل المدت اور منفرد رشتہ ہے۔ یہ رشتہ اس اعتبار سے بھی قابل غور ہے کہ دو انسان، ایک مرد اور ایک عورت مل کر ایک نئے خاندان کی بنیاد رکھتے ہیں اور عمر بھر اس خاندان کی نسبت سے ایسے جڑ جاتے ہیں کہ اگر یہ رشتہ ٹوٹ بھی جائے تو یہ نسبت باقی رہتی ہے۔ اس رشتے میں ہزاروں نشیب و فراز آتے ہیں۔ دن رات ایک دوسرے کے ساتھ رہنا اور ایک دوسرے کی ہر کمزوری، ہر طاقت، ہر عیب و ہنر سے واقف ہو جانا اس رشتے کی طاقت بھی ہے اور کمزوری بھی۔ دو انسان ہر لمحہ ایک دوسرے کی توقعات پر پورے نہیں اتر سکتے، اس لیے انھیں ایک دوسرے سے جڑے رہنے کے لیے کسی ایسی مضبوط وجہ کی ضرورت ہوتی ہے جو انھیں ہمیشہ قائل کر سکے کہ ایک دوسرے کے ساتھ رہنا، ایک دوسرے کے بغیر رہنے سے زیادہ مفید اور راحت بخش ہے۔

اسلامی طرزِ حیات میں اس رشتے کو بہت محترم کہا گیا ہے۔ میاں بیوی دونوں پر ایک دوسرے کے حقوق و فرائض لازم کیے گئے ہیں اور اسے قائم رکھنے کی کوشش کو مستحسن سمجھا جاتا ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کی رضا اور خوش نودی کے حصول کا راستہ ہے۔ مگر بد قسمتی سے معاصر مسلمان معاشروں میں ہمیں اس اصول کی زیادہ روشن مثالیں نہیں ملتیں۔

اس کمی کی وجوہات پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں مگر یہ کہنا ضروری ہے کہ جناب سمیع اللہ ملک نے ہمیں ایک مثالی مسلمان زندگی میں میاں اور بیوی کے درمیان تعلق کی ایسی تصویر دکھائی ہے جو ہمیں اپنے اردگرد نظر نہیں آتی۔ اس زندگی کا مرکز ذاتِ خدا تعالیٰ ہے۔ میاں اور بیوی دونوں کے پیشِ نظر خدا کی خوشنودی کا حصول مقصدِ حیات کے طور پر موجود ہے اور دونوں اس مقصد کے حصول کے لیے ایک دوسرے کے رفیقِ کار اور معاون و مددگار ہیں۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ دونوں کی یہ رفاقت صرف مقصدی نہیں بلکہ باہمی محبت اور سکون و اطمینان کا باعث بھی ہے۔

اس اعتبار سے یہ کتاب محض ذاتی یادداشتوں کا مجموعہ نہیں بلکہ مسلم معاشرے کے ایک ایسے مثبت رُخ کی جھلک دکھاتی ہے جو اب مسلم معاشروں میں

بھی عام نہیں رہا۔ اس میں عورت کے اس مقام کی بات ہے جو اسلام نے تو عورت کو دے رکھا ہے، مگر بیشتر مسلمان اسے تسلیم کرنے سے گریزاں نظر آتے ہیں۔ حقوق کے ساتھ ساتھ ہمیشہ فرائض بھی منسلک ہوتے ہیں اور دونوں کا متوازن تعامل ہی بہترین امکانات پیدا کر سکتا ہے۔

میں اس کتاب کی تصنیف اور اشاعت پر محترم جناب سمیع اللہ ملک کو ہدیہ تبریک پیش کرتی ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ کریم محترمہ ثمینہ سمیع کو اپنے قرب کی ممتاز منزلوں سے نوازے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔
آمین

نجیبہ عارف
صدر نشیں
پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز اسلام آباد
یکم رجب المرجب، ۱۴۴۷ ہجری / ۲۲ دسمبر ۲۰۲۵ء
اسلام آباد

حدیثِ وصال: نسائی عظمت کا سچا اعتراف

"حدیث وصال" کسی عام ذہنی یا فکری کیفیت میں لکھی گئی کتاب نہیں بلکہ یہ وہ کلام ہے جسے سمجھنے اور گرفت میں لینے کے لیے قاری کو بھی اسی وجدانی سطح پر اٹھنا پڑتا ہے جس سطح پر سمیع اللہ ملک صاحب نے اسے تخلیق کیا ہے۔ یہ کتاب محض ایک شخصیت کی سوانح یا یادداشت نہیں بلکہ شخصیت نگاری کا ایک نادر نمونہ ہے۔ مجھے ادراک ہے کہ یہ کتاب کسی سہولت یا آسانی سے نہیں لکھی گئی۔ اپنے رشتوں پر لکھنا خصوصاً کسی ایسے رشتے پر جس کی بنیاد محبت، قربانی اور تقدیس رہا ہو، دل کے خون سے لکھنے کے مترادف ہوتا ہے۔ یہ کتاب بھی آٹھ برس کی طویل صبر آزما خاموشی، مسلسل کرب اور کڑی تپسیا کے بعد ظہور میں آئی ہے۔

سمیع اللہ ملک صاحب سے ملنا میری زندگی کا ایک حیرت انگیز اور انتہائی خوش گوار واقعہ ہے۔ یہ یوں ہے کہ جیسے کسی ایسی سمت در کھلا ہے جہاں سے چھن چھن کر روشنی میرے اندر داخل ہو رہی ہے، دعائیں اتر رہی ہیں، رحمتوں کی پھوار ہے جو لحہ لحہ مجھ پر برس رہی ہے۔ چند لمحات پر مبنی ایک روح پرور ملاقات نے انھیں میرے دل میں اور مجھے ان کے دل میں وہ خصوصی جگہ عطا کی ہے جو برس ہا برس کے تعلقات میں بھی نہیں بن پاتی۔ سو اب وہ مجھے بیٹی مانتے ہیں اور میں انھیں بابا کہتی ہوں۔ انہوں نے میرے جواں مرگ بھائی، نامور شاعر، ادیب، نقاد کے نام کی مناسبت سے اپنے پوتے کا نام دانیال رکھا، جس کی خوشی بیان سے باہر ہے۔ میں اللہ کی بے حد شکر گزار ہوں کہ ان کے بہ قول میں اس روشن کتاب کی تخلیق کا سبب بنی۔ یہ احساس میرے لیے کسی سعادت سے کم نہیں ہے۔ میرے نام سے منسوب اس منفرد کتاب پر کچھ بھی لکھنا میرے لیے بہ یک وقت اعزاز بھی ہے اور امتحان بھی۔ ملک صاحب سے میرا قلبی اور روحانی تعلق، ان کی مایہ ناز عالمانہ شخصیت اور ثمینہ سمیع کی برگزیدہ ہستی، دونوں کے لیے کچھ بھی لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے چنانچہ میں اس کتاب پر جو بھی لکھوں گی وہ اسی مصرعے کے مصداق ٹھہرے گا کہ

حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

میں نے یہ کتاب لفظ بہ لفظ، ورق در ورق، دل کی آنکھوں سے پڑھی ہے۔ اسے ایک نشست میں پڑھنے کے لیے جو ہمت درکار تھی وہ مجھ ایسی حساس طبیعت میں ہرگز موجود نہیں۔ اس کتاب میں مصنف نے اپنی اہلیہ ثمینہ سمیع کی شخصیت کو جس محبت اور تقدیس سے رقم کیا ہے اس کی کوئی دوسری مثال اب تک میری نظر سے نہیں گزری۔ ایسا گہرا دوستی پر مبنی ازدواجی تعلق اور ایسی پاکیزہ رفاقت بہت کم دیکھنے سننے کو ملتی ہے۔ اس کتاب میں ثمینہ سمیع کی شخصیت کے تمام اوصاف، ذہنی و دینی مراتب اور ان کی زندگی کے اہم واقعات مکمل طور پر بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب عورت کی عظمت، ازدواجی رفاقت کی پاکیزگی اور اسلامی طرزِ زندگی کی معنویت کو نہایت وقار کے ساتھ اجاگر کرتی ہے۔ یہ کتاب ایک مکمل وجدانی کیفیت میں تحریر کی گئی ہے۔ جملوں کی ترتیب سے مصنف کی دل کی حالت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی اہلیہ کے بارے یوں تحریر کرتے ہیں جیسے کوئی پروانہ شمع کے گرد طواف کر رہا ہو۔

محبت کا یہ روپ انوکھا ہے جہاں ایک شوہر اپنی بیوی کے فراق میں تڑپ کر ایک ایسا شہ پارہ لکھ رہا ہے جس کی ہر ہر کیفیت جان لیوا ہے۔ کوئی اپنی بیوی سے ایسی محبت بھی کر سکتا ہے؟ ساری زندگی کی طویل رفاقت بھی ایسی تشنہ رہ سکتی ہے اور عشق کی ایک ایسی داستان میں ڈھل سکتی ہے، یہ سب عوامل غیر معمولی ہیں۔ ایک شوہر دل کے لہو سے اپنی رفیقِ حیات کی جدائی کا نوحہ رقم کر رہا ہے لیکن اس شدید کرب میں بھی ایک عجیب سا والہانہ پن موجود ہے، ایسی باوقار شریک حیات پانے کا تفاخر بھی موجود ہے اور دوبارہ ایک ہو جانے کی مکمل امید بھی، یہ سب عوامل ایک ساتھ سانس لے رہے ہیں۔

"حدیثِ وصال" محبت کی وہ داستان ہے جو روایتی رومان سے آگے بڑھ کر روحانی وابستگی میں ڈھل جاتی ہے۔ یہ جدائی کا نوحہ نہیں بلکہ اس یقین کا اظہار ہے کہ پاکیزہ رشتے وقت اور فاصلوں سے ماورا ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسا مکالمہ ہے جو موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ اس کتاب کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ بیوی کو محض یاد یا تصور نہیں، بلکہ ایک اخلاقی اور روحانی پیشوا کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اپنی جیون ساتھی کے لیے ایسی تعظیم کے ساتھ لکھی گئی ہے جیسے کسی ولی اللہ یا کسی بزرگ ہستی کے لیے کوئی عقیدت نامہ تحریر کیا جاتا ہے۔ "حدیثِ وصال" اس مقدس محبت نامے کے لیے اس سے زیادہ بامعنی اور موزوں عنوان کا قیام ممکن نہیں تھا۔ یہ عنوان ہی قاری کو بتا دیتا ہے کہ یہاں بیان محض یادداشت کا نہیں، بلکہ روحانی وابستگی اور دائمی مکالمے کا ہے۔ اس کتاب میں اسلوب کی بھی کئی خوبیوں کا غیر معمولی امتزاج ملتا ہے۔ احساس و جذبات کی شدت، وجدانی کیفیت، پُر تاثیر طرزِ بیان، تحیر انگیز یاداشتیں، برمحل اشعار، اقوال، واقعات اور ہر ہر منظر کی مکمل تصویر اس کتاب کو ایک اعلیٰ ادبی فن پارہ بھی بناتی ہے۔

میرے لیے عورت ایک دھلی ہوئی، پاک، شفاف، باوقار، گہری، کم گو، میٹھی اور شائستہ بولی بولنے والی، ہمہ وقت اپنے معبود کے عشق میں مگن، حبِ رسول ﷺ میں گم، بے نیاز، خوددار، حیادار، باعلم و باشعور، باوفا، نرم خو، دانا، سخی، خدمت گزار، محنتی، پُر سکون، کشادہ ظرف، تربیت گاہ، صابر، ہنر مند، فن کار، طلسماتی، ڈھکی چھپی، بھیدوں بھری کسی پر بھی نہ کھلنے والی ایک معمہ ہستی کا نام ہے۔ میں نے عورت کے اس مکمل روپ کو خود سمیت ہر جگہ تلاش کیا لیکن زیادہ تر اس کی ادھوری تصویریں ملیں۔ کوئی بھی عورت اپنے اصل مقام اور اپنی تخلیق کے اصلی جوہر سے واقفیت نہیں رکھتی۔ میرے نزدیک 'عورت' خدا کی سب سے حسین تخلیق ہے، اس زمین پر خیر و امن و محبت کی پیمبر۔ اسی کے دم سے دنیا پر رحمت برستی ہے، رزق اترتا ہے، اسی کے ممتا بھرے وجود سے دنیا رہنے کے قابل جگہ ہے، اسی کی دعا سے بلائیں گھروں میں اترنے سے پہلے ہی ٹل جاتی ہیں۔ اس کی تخلیق میں کسی طرح کی آلودگی اور شر شامل نہیں کیا گیا لیکن بہت کم عورتیں اپنے خمیر میں چھپے ان اوصاف کا ادراک رکھتی ہیں، زیادہ تر اپنی فطرت کے برخلاف زندگی گزارنے ہی کو کامیابی تصور کرتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ آج کی دنیا میں ممتا کمزور اور دعائیں سرد پڑ گئی ہیں، اسی لیے چہار جانب سے آفات کا نزول ہونے لگا ہے اور گھر گھر بے سکونی پھیل رہی ہے۔

"حدیثِ وصال" مجھے اس امید کی صورت ملی کہ ابھی دنیا میں ایسی آئیڈیل عورتیں سانس لے رہی ہیں جو عورت کے خدائی پیکر کا کشف رکھتی ہیں اور کچھ یہاں سے جانے کے بعد بھی اپنی خیر، اپنی برکت اس زمین پر چھوڑ گئی ہیں، ابھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ابھی اپنے اندر اور دنیا میں اس آئیڈیل عورت کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ مجھے اس کتاب میں ثمینہ سمیع کی شکل میں، دینی اور تاریخی کتابوں میں بسی وہ آئیڈیل عورت مجسم دکھائی دی جو اب کم کم امکان رکھتی ہے، دین کو اوڑھنا بچھونا بنانے والی یہ نیک خاتون ایک خوب صورت خواب سا لگیں جس کو دیکھنے کے بعد دل اطمینان سے بھر گیا

ثمینہ سمیع لڑکپن ہی میں اس نیلی چھتری والے کو دل دے بیٹھی تھیں سو اپنے آپ سے بیگانہ، دنیا مافیا سے بے خبر اسی کے عشق کی لے پر رقصاں رہتی تھیں۔ دنیا کی ظاہری کشش اور اس کے مکر و فریب، جوانی ہی میں ان کے لیے بے معنی ہو گئے تھے۔ رب کی ازلی خاموشی سے ہم کلام ہونے کے لیے وہ دیوانہ وار، بار بار اس کے کلامِ پاک کی طرف دوڑتی تھیں۔ عشقِ رسول ﷺ ان کی اوڑھنی تھا اور ایمان ان کی نسوانیت کی ڈھال۔ ان کی حیا عبادت بن چکی تھی اور عبادت روزمرہ۔ وہ آیتوں میں چھپے کوڈز کھولنے کا فن سیکھ چکی تھیں اور درود میں بات کرنے کا ہنر۔

انہوں نے سر جھکا کر پیچھے پیچھے چلنے کا ظرف سیکھ لیا تھا۔ ان کے ہاتھ، دائیں ہاتھ والوں کے مقام سے واقف ہو چکے تھے۔ وہ پرندوں کی بولی جانتی تھیں اور پرندے ان کی خاموشی۔ پرندے کیا واقعتاً ان کے حال و قال سے واقف تھے جو آج بھی سینکڑوں کی تعداد میں ان کی خاموش مرقد کا طواف کرتے

نہیں تھکتے ؟کتاب اور تصاویر میں محفوظ یہ راز ان کی شخصیت کو اور بھی طلسماتی بناتا ہے۔

ثمینہ سمیع نے اپنے مضبوط ایمان، عبادات کی کثرت، مسلسل صبر، استقامت، اپنے شوہر سے بے لوث محبت اور دعاؤں کی عظمت سے وہ مقام پالیا تھا کہ رب سے اپنے وصال کی شب 'خودی کو کر بلند اتنا' کے مصداق، خود منتخب کی۔ شب قدر وہ شب ہے جب آسمان کے سارے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، انوار کی بارشیں برستی ہیں، پاکیزہ روحیں اپنے رب کی طرف لوٹتی ہیں، ان کا بلاوہ بھی اسی شب آیا۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے استقبال کے لیے کئی پرندے چونچ میں گلاب لیے کھڑے ہوں گے۔ اس بابرکت شب میں وصال اور جمعۃ الوداع کو تدفین کسی عام ہستی کے حصے نہیں آتی اور اس غیر معمولی واقعے کا عینی شاہد بھی کوئی معمولی شخص نہیں بنتا، اس کے لیے بھی سمیع اللہ ملک جیسے کسی ذی شعور کا انتخاب کیا جاتا ہے جس کو قلم کی وہ حرمت وطاقت بخشی گئی ہوتی ہے جو ثمینہ کی بے مثال شخصیت کا پورٹریٹ بنا سکے۔

ایمان۔ یہ محض ایک لفظ نہیں ہے ہر لمحے کی کسوٹی ہے۔ رب کی محبت ہر ہر لمحے ہم سے سوال کرتی ہے کہ قدم میری طرف بڑھاؤ گے یا دوسری جانب جو بہ ظاہر بہت پُرکشش دکھائی دے رہی ہے۔ لیکن جو رب سے لو لگالے وہ دوسری جانب کیسی ہی حسین کیوں نہ ہو اپنی طرف کسی بھی ہتھ کنڈے سے کیوں نہ کھینچ رہی ہو اور اس جانب کتنے ہی خوف، وسوسے اور مشکلات کیوں نہ ہوں، پاؤں دیوانہ وار بڑھاتا چلا جاتا ہے جو رب کو پہچان لے وہ پھر دوسری جانب پلٹ کر نہیں دیکھتا نہ ہی اس کے قدم لڑکھڑاتے ہیں۔ یہی وہ مسلسل عمل ہے پُل صراط پر چلنے کے مترادف جسے ایمان کہا جاتا ہے۔ یہ کوئی آسان فیصلہ نہیں، یہ کوئی پھولوں بھرا راستہ نہیں، یہی آزمائش ہے، یہی امتحان، اسی پر آخرت کے فیصلے ہوں گے، یہی عشق کا مقام ہے جس کو اختیار کرنے کے بعد کسی شرک کی گنجائش نہیں، محبوب کی رضا سے بڑی کوئی خواہش نہیں اور اس راستے پر چلنے والے دیوانوں سے پھر کوئی پُرسش نہیں، ثمینہ سمیع کی زندگی ہمیں اس لفظ کے معنی کس سلیقگی سے سکھاتی ہے جسے ہم ایمان کہتے ہیں۔ گویا ماں جی نے بیٹی کو ایمان کے معنی سکھادیے ہیں۔

کچھ باتیں یا اشخاص زندگی میں ایسی ہوتے ہیں جن کے بارے لکھنا ہمیں تذبذب میں مبتلا کیے رکھتا ہے لیکن میں زندگی کی موجودہ بگڑی ہوئی صورتوں کو دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ جسے لکھنے کی توفیق ودیعت کی گئی ہو اسے اپنے حصے کا سچ مکمل لکھ کر تاریخ کا حصہ بنادینا چاہیے یہی ہمارے حصے کا خیر ہے جو ہمیں بیج کر جانا چاہیے اگر سمیع اللہ ملک صاحب ثمینہ سمیع کی شخصیت، خود پر بیتے یہ باطنی حقائق اور اپنے ایمان ویقین کا یہ پُرتحیر سفر رقم نہ کرتے، تو ظلم کرتے۔ وہ قلم دوام پائیں جو اللہ اور رسول کی عظمت، نیکی اور خیر کے ترانے لکھنے کے لیے اٹھائے جاتے ہیں، سمیع اللہ ملک کے قلم کی خیر ہو ان کی کتابیں ہمیشہ روشن رہیں روشنی بانٹتی رہیں اور ان کی بخشش کا سامان بنیں آمین۔

''حدیثِ وصال''، ہمیں سکھاتی ہے کہ کچھ رشتے وصال اور فراق کی حدوں سے ماورا ہوتے ہیں، وہ جدا ہو کر بھی جدا نہیں ہوتے، ان میں مکالمہ جاری رہتا ہے، وہ وقت، موت اور ہر طرح کے فاصلے سے ماورا، ایک دوسرے میں دھڑکنے کا کشف پالیتے ہیں۔ اس کتاب کا دوسرا وصفِ خاص یہ ہے کہ یہ محض کسی ایک عورت یا اپنی بیوی کی تعریف پر مبنی کتاب نہیں بلکہ یہ عورت کے اس ازلی تصور کی بازیافت ہے جو وقت کی گرد میں اوجھل ہوتا چلا جارہا ہے۔ میرے لیے یہ کتاب اس لیے بھی انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں عورت کو محض ایک سماجی کردار کے طور پر نہیں بلکہ کائناتی خیر کے منبع کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ میری دعا ہے کہ سمیع اللہ ملک صاحب طویل عمر پائیں اور ان کا قلم ایسے شاہ کار تراشتا رہے۔ مرحومہ ثمینہ سمیع تمام برگزیدہ ہستیوں کے ساتھ دائمی اور ابدی سکون میں رہیں اور ان کے روحانی فیض اور برکات سے ہم سب مستفید ہوتے رہیں آمین۔

ڈاکٹر قندیل بدر
اسسٹنٹ پروفیسر اردو
سردار بہادر خان ویمنز یونیورسٹی بلوچستان کوئٹہ

صدائے روح

سمیع اللہ ملک کی تحریروں میں مغرب کے دوہرے معیارات کا نہایت گہرا اور مدلل اظہار ملتا ہے۔ خصوصاً اسلام کے بارے میں مغربی معاشروں میں پائی جانے والی نفرت، اس کی شدت اور اس کی فکری و تہذیبی جڑیں اُن کے مختلف کالموں اور تجزیاتی مضامین میں پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہیں۔ وہ اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ مغرب محض نظریاتی سطح پر ہی نہیں بلکہ عملی اور سیاسی سطح پر بھی اسلام کو ایک تہذیبی چیلنج کے طور پر دیکھتا ہے، جس کے نتیجے میں اسلاموفوبیا کو شعوری یا لاشعوری طور پر فروغ دیا جاتا ہے۔ ان کی تحریروں سے یہ حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے کہ مغرب عالمی سطح پر اپنی برتری اور غلبے کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے سیاسی، عسکری اور معاشی مفادات کو ہمیشہ مقدم رکھتا ہے۔ اُن کے مختلف کالمز اور تجزیاتی تحریریں مغرب کی فکری، سیاسی اور معاشی حکمتِ عملیوں کو بے نقاب کرتی ہیں اور یہ واضح کرتی ہیں کہ مغرب کا طرزِ عمل اصولوں سے زیادہ مفادات پر مبنی ہے۔ ان تحریروں کے ذریعے قاری کو نہ صرف مغربی بیانیے کی اصل نوعیت سمجھنے میں مدد ملتی ہے بلکہ عالمی سیاست اور معیشت کے پوشیدہ محرکات بھی کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔

ان کے کالموں میں یہ نکتہ نہایت وضاحت سے سامنے آتا ہے کہ اگر جمہوری عمل کے نتیجے میں اسلام پسند قوتیں اقتدار میں آجائیں تو مغرب اسی جمہوریت کی مخالفت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یوں جمہوریت کو ایک عالم گیر قدر کے بجائے اپنے مفادات کے تابع ایک آلہ بنالیا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں مسئلہ کشمیر اور فلسطین کو محض سیاسی تنازعات کے طور پر نہیں بلکہ انسانی المیے اور عالمی ضمیر کے امتحان کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان کے تجزیے میں امریکی اور برطانوی پالیسیوں کا تنقیدی جائزہ پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آتا ہے، جہاں یہ طاقتیں اپنے مفادات کی خاطر اصولوں اور اخلاقی دعوؤں سے انحراف کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اسی طرح اسرائیلی طرزِ عمل اور بھارتی ہندوانہ نظریے پر مبنی عزائم کو وہ نہایت جرات مندانہ انداز میں بے نقاب کرتے ہیں اور یہ واضح کرتے ہیں کہ کس طرح طاقت، بیانیے اور سفارتی حربوں کے ذریعے مظلوم اقوام کی آواز دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اس تمام تجزیے میں ان کا اسلوب نہایت متوازن، مدلل اور شائستہ ہے۔ وہ جذباتیت کے بجائے دلیل اور فکری بصیرت سے کام لیتے ہیں، جس کے باعث ان کی تحریر قاری کو قائل بھی کرتی ہے اور سوچنے پر بھی مجبور کر دیتی ہے۔ یہی رواں اور پختہ اسلوب ان کے کالموں کو محض تبصرہ نہیں بلکہ سنجیدہ فکری دستاویز بنا دیتا ہے۔ ان کا قلم نہ صرف سیاسی شعور بے دار کرتا ہے بلکہ قاری کو عالمی سیاست کے پوشیدہ چہروں کو پہچاننے کی صلاحیت بھی عطا کرتا ہے۔

تاہم ان کی کتاب، حدیثِ وصال اس اسلوبِ تحریر سے بالکل مختلف نظر آتی ہے جس کے تحت وہ برسوں سے کالم اور تجزیے لکھتے آرہے ہیں۔ اس کتاب میں سیاسی تنقید یا عالمی معاملات کے بجائے صوفیانہ فکر کی گہری جھلک ملتی ہے، جہاں وہ پردۂ تحریر کے پیچھے اخلاقی تربیت اور روحانی بالیدگی کا درس دیتے ہیں۔ یہاں قلم کا لہجہ احتجاجی اور تنقیدی نہیں بلکہ معلمانہ ہے۔ وہ انسانی اقدار، محبت، وفا اور ذمہ داری کے تصورات کو نہایت سلیقے سے پیش کرتے ہیں۔ خصوصاً خواتین کے کردار کی وضاحت میں ان کا انداز متوازن اور باوقار ہے، جہاں عورت کو محض سماجی کردار تک محدود نہیں کیا جاتا بلکہ اسے اخلاقی قوت، روحانی رفیق اور فکری استحکام کی علامت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ یہ کتاب انہوں نے اپنی اہلیہ ثمینہ سمیع کے انتقال کے آٹھ برس بعد تحریر کی۔ وہ خود اس کتاب کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی کمائی قرار دیتے ہیں اور قارئین کے سپرد کرتے ہوئے دعا گو ہیں کہ اللہ اسے اُن کے لیے

نافع بنائے اور دلوں کے لیے باعثِ سکون ٹھہرائے۔

یہ کتاب اس لحاظ سے بھی غیر معمولی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی اہلیہ کا ذکر زبان پر کم ہی لاتے تھے اور قلم کے ذریعے تو کبھی نہیں، مگر یہاں انہوں نے اس دیرینہ التزام کو توڑ دیا۔ وہ مشرقی معاشرت کی اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ ہم اپنے گھروں کی عورتوں کی وفاداری، سچائی، محبت اور وقار کو دل میں تو بسائے رکھتے ہیں، مگر انہیں لفظوں میں ڈھالنے سے جھجک محسوس کرتے ہیں، لیکن جب بات نسائی تربیت کی ہو یہ شرم و جھجک خود بہ خود پسِ پشت چلی جاتی ہے۔ یہاں یہ اعتراف کسی ذاتی جذبے تک محدود نہیں رہتا بلکہ اسلامی شعار کو اپنانے والی خواتین کی اخلاقی عظمت کے اعتراف کا معاملہ ہوتا ہے۔ بہ ظاہر یہ تذکرہ ایک فردِ واحد کا ہے مگر دراصل اس کا خطاب تمام خواتین ہیں جو وقار اور عظمتِ کردار کی علامت ہیں۔

محبت کائنات کی سب سے خوب صورت حقیقت ہے۔ محبت جو محض جذبہ نہیں بلکہ انسان کو باطن سے سنوارنے والی قوت ہے۔ مشرقی تہذیب میں میاں بیوی کی محبت صرف وقتی اور عارضی احساس کا نام نہیں بلکہ اعتماد، وفاداری، ایثار، تعلقات کی مضبوطی، تحفظ، تکمیلِ ذات اور روحانی رفاقت کا ایک ایسا رشتہ ہے جو زندگی کو سکون، استحکام اور معنویت عطا کرتا ہے۔

سمیع اللہ ملک کی محبت نے ثمینہ سمیع کو محض ذاتی احساسات تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے دوسروں کے درد کو محسوس کرنے، تکلیف کو سمجھنے اور انسانوں کے دکھ میں شریک ہونے کی طرف متوجہ کیا۔ اس کے اندر ایک فطری بے چینی اور اضطراب ہے جو مادیت کے بہ جائے اخلاقیات اور روحانیت آراستہ ہے۔ وہ محبت کو صرف انسانی رشتوں تک محدود نہیں رکھتی بلکہ درختوں، پرندوں اور زمین کے باسیوں تک پھیلا دیتی ہے۔ اس کے دل میں محبت کا ایک سمندر موجزن ہے جو خلوص، سچائی اور ہم دردی کے جذبوں سے لب ریز ہے۔

کتاب میں مسلم خواتین کے بارے میں مغرب میں اٹھائے گئے حجاب کے مباحث کے تناظر میں بھی اس کے کردار کو پیش کیا گیا ہے، جہاں وہ ایک باوقار، باشعور اور اخلاقی طور پر مضبوط عورت کی صورت سامنے آتی ہے۔ ایسی عورت جو ظاہری نعروں کے بہ جائے کردار کی گہرائی سے اپنا مقام متعین کرتی ہے۔ وہ زندگی کی حقیقی سچائیوں کی طلب گار ہے، اور یہی طلب اسے دائمی سکون، اطمینان اور قلبی راحت عطا کرتی ہے۔

حدیثِ وصال اس حقیقت کو بھی اجاگر کرتی ہے کہ گھر کا ماحول انسانی شخصیت کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ سکون اور محبت سے بھرا گھر زندگی کو سنوار دیتا ہے، جب کہ انتشار اور بے چینی زندگی کو بوجھ بنا دیتے ہیں۔ اس حوالے سے سمیع اللہ ملک خود کو خوش نصیب قرار دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی شریکِ حیات عطا کی جو ان کے ہر دکھ اور ہر تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتی ہے، جو مدد اور ایثار کو اپنی اولین ترجیح بناتی ہے اور ہر حال میں دوسروں کے کام آنے کے لیے آمادہ رہتی ہے۔ ثمینہ سمیع کے دکھ، قربانی اور ایثار کی تاثیر ایسی ہے جو سخت سے سخت دل کو بھی پگھلا دیتی ہے۔ وہ جذبۂ خلوص اور قربانی سے لب ریز ایک مثالی بیوی کے طور پر سامنے آتی ہے۔ ایسی بیوی جس میں اللہ تعالیٰ نے وہ تمام اوصاف ودیعت کیے ہیں جو شوہر کے لیے کشش، سکون اور قلبی اطمینان کا باعث بنتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے مرد، خصوصاً شریکِ حیات بہت کم ہوتے ہیں جو عورت، بالخصوص بیوی کی قربانی کو نہ صرف تسلیم کریں بلکہ اسے فکری اور اخلاقی قدر کے طور پر پیش کریں۔ ثمینہ سمیع کے حوالے سے انہوں نے عورت کا ایک ایسا باوقار تصور پیش کیا ہے جو محض جذباتی نہیں بلکہ مقصدِ حیات سے جڑا ہوا ہے، اور زندگی کو ایک مشن کے طور پر گزارنے کی تلقین کرتا ہے۔

ان کی تحریر کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ وہ قائل کرنے کا ہنر خوب جانتے ہیں۔ علامتی اسلوب ان کی اس کتاب میں بھی مختلف واقعات کے تناظر میں جھلکتا ہے، جہاں جگہ جگہ علامت نگاری کے ذریعے زندگی کے نشیب و فراز کو معنی عطا کیے گئے ہیں۔ وہ زندگی کے خارزار میدانوں سے

نصیحتوں کی صورت میں ایسا اسلوب کشید کرتے ہیں جو محض خطیبانہ وعظ نہیں بلکہ تجربے اور کردار سے پھوٹنے والی دانائی محسوس ہوتا ہے۔یوں ثمینہ سمیع کا کردار محض ایک فرد کی یاد نہیں رہتا بلکہ ایثار، قربانی اور خلوص کی علامت بن کر سامنے آتا ہے۔ایک ایسا کردار جو بہنوں، بیٹیوں اور معاشرے کے دیگر افراد کے لیے گناہوں سے بچنے، سچائی اپنانے اور مقصدی زندگی گزارنے کی عملی مثال فراہم کرتا ہے۔اسی پہلو سے حدیثِ وصال، محض ذاتی نوحہ نہیں بلکہ اخلاقی اور فکری تربیت کی ایک بامعنی تحریر بن جاتی ہے۔دعا ہے کہ جس عظیم مقصد کے لیے یہ کتاب تخلیق کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ اسے پورا ہونے کا وسیلہ بنائے اور قارئین کے لیے سکون و خیر کا سبب قرار دے (امین)

ڈاکٹر فرزانہ خدرزئی
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو گورنمنٹ گرلز ماڈل ڈگری کالج جناح ٹاؤن کوئٹہ

حدیثِ وصال—وفا، رحمت اور ازواجی محبت کی عطر بیز کہانی

اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

"وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے۔"(البقرہ:187)

کس قدر بلیغ اور ہمہ گیر مثال ہے—لباس جو جسم کی ستر پوشی بھی ہے اور دل کے سکون کا محافظ بھی؛ جو وجود کے ساتھ اس طرح جڑ جاتا ہے کہ جدائی کا تصور بھی دل کو چیرنے لگتا ہے۔ یہی تمثیل درحقیقت میاں اور بیوی کے مقدس رشتے کی حقیقی روح ہے—ساتھ ہونا فقط رہائش نہیں، بلکہ ایک دوسرے کا سہارا، عزت، تحفظ اور پردہ بن جانا ہے۔

مزید ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے جوڑے بنائے تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو، اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت رکھ دی۔(سورۃ روم:21)

یہ آیت بتاتی ہے کہ ازدواج محض معاشرتی بندوبست نہیں؛ یہ اللہ کی آیت ہے، اس کا نشان ہے۔ اس میں محبت بھی ہے اور رحمت بھی—اور یہی دو اجزاء گھر کو مکان سے گھر اور پھر گھر سے جنّت بناتے ہیں۔

رسولِ اکرم ﷺ نے عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کو ایمان کے کمال سے جوڑا۔ خطبۂ حجۃ الوداع جیسے عظیم اجتماع میں بھی آپ ﷺ نے خصوصی تاکید فرمائی:

"...عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو، ان کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ"

یوں گویا یہ درس دیا گیا کہ عزت، نرمی، شفقت اور عدل کے بغیر ازدواجی زندگی کا پیمانہ کبھی نہیں بھر سکتا۔ اسلام کے نزدیک شوہر اور بیوی کے حقوق و فرائض دو ترازو پلڑوں کی مانند ہیں—دونوں جب برابر ہوں تو زندگی کا میزان قائم رہتا ہے۔

محبت اور فراق سے لکھی گئی کتاب

—میرے سامنے اس وقت ایک ایسی کتاب رکھی ہے جو صرف صفحات کا مجموعہ نہیں بلکہ دھڑکتے دل کی دستاویز ہے

فراق کی تپش اور محبت کی خوشبو سے معطر تصنیف۔

یہ کتاب محترم سمیع اللہ ملک صاحب کی تخلیق ہے، اور یہ صرف لکھا ہوا کلام نہیں بلکہ ایک جیتی جاگتی یادوں کا محرم خزانہ ہے جس میں ان کی رفیقِ حیات مرحومہ ثمینہ سمیع کی پاکیزہ زندگی سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔ یہ کتاب پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک ایسی ازدواجی زندگی بسر کی جو صرف ساتھ رہنے کا نام نہیں تھی بلکہ

باہمی احترام

ایثار

دینی شعور

سنتِ نبوی ﷺ کی پیروی
کا عملی نمونہ تھی۔

کنیزِ فاطمہ — ایک نسبت، ایک طرزِ زندگی

میری اپنی والدہ مرحومہ کی قبر کے کتبے پر ان کی وصیت کے مطابق صرف یہ الفاظ کندہ ہیں:

"کنیزِ فاطمہ"

مرحومہ ثمینہ سمیع کی زندگی بھی اسی نسبت کی حسین تصویر تھی۔ انہوں نے صرف یہ الفاظ نہیں کہے بلکہ عملاً ثابت کیا کہ عورت کا جمال اس کے طرزِ زندگی، حیا، عبادت اور خدمت میں ہے۔

حدیثِ وصال سے ایک جھلک

محترم سمیع اللہ ملک اپنی کتاب حدیثِ وصال میں لکھتے ہیں

اہلیہ اکثر کہا کرتیں:

آپ کی خدمت میرے لیے عبادت ہے،

آپ کی خوشی میرے رب کی رضا ہے،

اور آپ کا ہر دکھ میری دعا کا حصہ ہے۔

مسافرِ حدیث سوچتا رہتا:

یہ عورت محض شریکِ حیات نہیں،

یہ میری روح کی رہنمائی،

میری تحریروں کی روشنی،

میری ہر دعا کی حقیقت ہے۔

یہ محض جملے نہیں — یہ ایک عہدِ وفا کی شہادت ہیں۔

آج کی نسل کے لیے پیغام

"حدیثِ وصال" ان لوگوں کے لیے انمول تحفہ ہے جو شادی کو بوجھ نہیں عبادت سمجھتے ہیں، جو تعلق کو وقتی دل لگی نہیں بلکہ ذمہ داری جانتے ہیں۔

یہ کتاب:

بے صبر دور کے لیے صبر کا سبق

ناشکری زمانے کے لیے شکر کی اذان

ٹوٹتے رشتوں کے لیے جوڑنے والی ڈور

ثابت ہو سکتی ہے۔

ہر اس نوجوان جوڑے کے لیے جو:

محبت

رحمت

برداشت

دیانت

اور اللہ کی رضا

—پر مبنی گھر بسانا چاہتا ہے

حدیثِ وصال "ایک رول ماڈل ہے۔"

اختتامی دعا

اللہ تعالیٰ مرحومہ ثمینہ سمیع پر اپنی بے پایاں رحمتیں نازل فرمائے،

ان کے درجات بلند فرمائے،

اور محترم سمیع اللہ ملک صاحب کی اس محبت و وفا کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔

آمین ثم آمین

دعا گو: بہن طیبہ ضیا چیمہ —

نیویارک

حدیثِ وصال—ایک مقبولِ بارگاہ روحانی ماں کی خوشبو دار یادیں

بیگم ثمینہ سمیع اللہ ملک—میرے لیے محض ایک بزرگ خاتون نہیں تھیں؛
وہ میرے لیے ماں کے درجے کی ہستی تھیں۔ دل کا سہارا، دعا کا وسیلہ، روح کا ایک پر سکون سایہ۔

—محترم ڈاکٹر سمیع اللہ ملک نے اپنی شریکِ حیات کی زندگی پر جو کتاب تحریر کی ہے، وہ محض سوانح نہیں، ایک زندہ دستاویز ہے،
ایسی دستاویز جو محبت، روحانیت، وفا اور ایثار کے چراغ جلا کر قاری کے دل میں ایک نئی دنیا آباد کر دیتی ہے۔
—یہ کتاب بیگم ثمینہ سمیع کی زندگی کے متنوع پہلوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے،
ایک صاحبِ علم بیوی، ایک مشفق ماں، ایک باوقار قانون دان، اور سب سے بڑھ کر اللہ کی خاص بندی۔

بیگم صاحبہ ایک نہایت پڑھی لکھی، صاحبِ بصیرت اور اعلیٰ تعلیم یافتہ قانون دان تھیں۔ مگر ان کی شخصیت کا سب سے تابناک پہلو ان کا اللہ سے والہانہ تعلق تھا۔ دنیاوی مرتبوں اور ظاہری اعزازات سے کہیں بڑھ کر وہ روحانیت کے اُس مقام پر فائز تھیں جہاں دل باطن کی روشنی سے جگمگانے لگتا ہے۔
بیماریوں کی یلغار کے باوجود اُن کی زبان شکر سے تر رہتی، چہرے پر اطمینان کی چادر، دل میں شکر کا چراغ، اور لبوں پر رضا کی مسکراہٹ۔

اللہ کے خاص مقربین اور اہلِ دل اولیاء بھی اُن کے پاس دعاؤں کے لیے حاضر ہوا کرتے تھے۔ یہ منظر بارہا دیکھنے میں آیا کہ وہ دعاؤں کے لیے آتے، انکساری کے ساتھ بیٹھتے، دعاؤں کی سوغات لے کر الٹے قدموں لوٹتے—گویا کوئی نور ساتھ باندھ کر جا رہے ہوں۔

مجھے بھی یہ اعزاز نصیب ہوا۔ یہ گناہگار جب اُن کے حضور حاضر ہوا تو انہوں نے محبت سے نظر اٹھائی، شفقت سے مسکرائیں، اور میرے لیے استقامتِ ایمان کی دعا کی۔ ان کا یہ احسان میری زندگی کا سرمایہ ہے۔ جن مسائل کے حل کے لیے برسوں دروازے کھٹکھٹائے تھے، وہ ربّ کریم نے ان کی دعا کی برکت سے لمحوں میں آسان کر دیے۔

—مجھے اپنا وہ دن آج بھی یاد ہے،
ایم آر سی سائیکاٹری کا مشکل ترین امتحان سر پر تھا، پریشانی دل میں گھر کیے بیٹھی تھی۔
میں ان کی عیادت کے لیے نرسنگ ہوم پہنچا۔ وہ بیماری کے باوجود خاموشی سے لوگوں میں تسلی اور دعاؤں کا فیض بانٹ رہی تھیں۔ میں نے ادب سے
—درخواست کی، انہوں نے نظر اٹھائی
اور بس—یہی کافی تھا۔
اللہ نے کرم کیا اور وہ کٹھن مرحلہ آسان ہو گیا۔ میرا امتحان کامیابی سے گزر گیا۔ آج بھی یہ کامیابی میں اپنی محنت سے زیادہ ان کی دعا کی دین سمجھتا ہوں۔

—پھر 2017 کا وہ مبارک لمحہ آیا
—27 رمضان، شبِ قدر کی نورانی ساعتیں

اسی برکتوں سے لبریز شب میں وہ اپنے رب سے جا ملیں۔
کیا ہی حسین مقدر ہے کہ رخصتی کا لمحہ بھی لیلۃ القدر کی چادر میں لپٹا ہوا ہو۔
—میں نے ان کے جنازے اور تدفین میں شرکت کی
اور پھر قدرت نے ایک دل نشین منظر دکھایا۔
—لندن کا وہ دن خشک تھا؛ بادل تو تھے مگر بارش کہیں نہیں۔ جیسے ہی ان کے جسدِ خاکی کو قبر کے سپرد کیا گیا اور مٹی ڈالنے کا عمل شروع ہوا
قبرستان کے اندر ہلکی ہلکی پھوار برسنے لگی،
جبکہ قبرستان کے باہر ہر شے خشک تھی۔
—یہ بارش نہیں تھی
یہ رحمت تھی۔
اللہ کی رحمت—جو ان پر اور ان کے آس پاس کی قبروں پر خاص طور پر نازل ہو رہی تھی۔
چشمِ فلک نے یہ منظر دیکھا اور شاید مسکرا کر رحمت کے اس نزول کی گواہی دی۔

—ثمینہ سمیع کی یہ زندگی
وفا کی تفسیر، شکر کی تشریح، رضا کا عنوان،
—اور دعا کی قبولیت کا استعارہ
ڈاکٹر سمیع اللہ ملک نے جب اسے قلم کی صورت دی تو
اس تحریر نے صرف کتاب نہیں، بلکہ ایک عہد کو امر کر دیا۔
اللہ تعالیٰ بیگم ثمینہ سمیع کے درجات بلند سے بلند تر فرمائے،
انہیں اپنے مقربین میں جگہ عطا فرمائے،
اور ان کے فیوض و برکات ہمیں بھی نصیب فرمائے۔
آمین ثم آمین

ڈاکٹر کامران اصغر
ڈونیگال، آئرلینڈ

عشق کی وہ رہگزر جہاں جدائی نہیں

میرے قابل احترام مرشد، میرے روحانی باپ سمیع اللہ ملک صاحب!

حدیثِ وصال "میرے لیے محض اوراق پر بکھرے الفاظ نہیں رہے، یہ تو میرے دل کی راہوں میں اتر جانے والا ایک باطنی سفر بن گئی ہے۔ ایسا سفر، جہاں دل آہستہ آہستہ شکوے کے صحرا سے نکل کر تسلیم کی گھاٹیوں میں داخل ہوتا ہے، اور پھر تسلیم کے دامن سے ہوتے ہوئے رضا کی روشن چوٹیوں تک پہنچ جاتا ہے۔ آپ کی تحریر میں یہی سکون، یہی ٹھہراؤ، یہی نور سب سے زیادہ محسوس ہوتا ہے۔

آپ نے شریک حیات کا ذکر یاد کے کرب میں نہیں لکھا، آپ نے انہیں رضا کی روشنی میں محفوظ کر دیا۔ وہی رضا جو صوفیا کے نزدیک صبر کی آخری سیڑھی اور منزل نہیں، بلکہ محبت کی پہلی منزل اور پہچان ہوتی ہے۔ یہاں پہنچ کر دکھ، دکھ نہیں رہتا—وہ حکمت بن جاتا ہے، جہاں پہنچ کر دکھ اپنا نام بدل لیتا ہے—وہ درد نہیں رہتا، وہ حکمت بن جاتا ہے؛ فراق اپنی شکل بدل کر وصال ہو جاتا ہے۔

اس کتاب میں ایک واضح مقام وہ ہے جہاں قاری محسوس کرتا ہے کہ لکھنے والا خود سے آگے نکل چکا ہے بلکہ لکھنے والا فنا کے مرحلے سے گزر چکا ہے۔ اپنی خواہش، اپنی آواز، حتیٰ کہ اپنے غم کو بھی پیچھے چھوڑ کر صرف وہی لکھ رہا ہے جو خواہش کی قید سے، اپنی آواز کے غرور سے، اپنے غم کے حصار سے بھی آگے... اور فقط وہی لکھ رہا ہے جو دل پر الہام بن کر اترا، جو اوپر سے عطا ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تحریر خود کو نہیں دکھاتی، حق کو ظاہر کرتی ہے—یہ حق کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

زندگی کے ہمسفر کا تذکرہ اس کتاب میں ایک وجود سے آگے بڑھ کر معنی بن جاتا ہے۔ وہ معنی جو خاموش خدمت میں، بے آواز تربیت میں، اور خود کو مٹا کر دوسروں کو سنوار دینے میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ یہی فنا ہے—اور فنا کے بعد جو ٹھہراؤ آتا ہے، وہی بقا ہے۔

اس کتاب میں شریکِ حیات کا ذکر ایک وجود سے بڑھ کر ایک معنی بن کر سامنے آتا ہے—وہ معنی جو خاموش خدمت میں چھپا ہوتا ہے، بے آواز تربیت میں جلوہ گر ہوتا ہے، دوسروں کو سنوار دینے میں اپنی پہچان پاتا ہے۔ اور خود کو مٹا کر دوسروں کو سنوار دینے میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ یہی فنا ہے... اور فنا کے بعد جو ٹھہراؤ نصیب ہوتا ہے، وہی بقا ہے۔

ہم نے اس کتاب سے یہ سیکھا کہ بقا یاد کے نام پر نہیں، نسبت کے نام پر ملتی ہے۔ ماں جی آج بھی ہمارے درمیان ہیں—ہماری دعاؤں کے لہجے میں، ہمارے صبر کے رنگ میں، ہمارے شکر کی خوشبو میں۔ صوفیا نے سچ کہا تھا:
جو محبت فنا ہو جائے، وہی بقا پا لیتی ہے۔

آپ کی اس کتاب میں ماں جی کی رفاقت ہمیں اس طرح ملی کہ دل کو یقین آ گیا کہ محبت کا وصال جسم کے ساتھ ختم نہیں ہوتا؛ وہ دعا بن کر، صبر بن کر، شکر بن کر دلوں میں زندہ رہتا ہے۔ آپ نے ماں جی کی یاد کو آنسوؤں کے حوالے نہیں کیا، آپ نے اسے سجدوں کے سپرد کر دیا—اور یہی صوفی کا راستہ ہے۔

جہاں جہاں اس کتاب میں ہمارا ذکر آیا، وہاں ہمیں اولاد ہونے سے زیادہ امانت دار ہونے کا احساس ہوا۔ ہمیں یہ شعور ملا کہ ہمیں کسی دکھ کی وراثت نہیں ملی، ہمیں رضا کی تربیت ملی ہے۔ اور یہی تربیت ہمیں زندگی کے ہر موڑ پر تھامے رکھے گی، انشاء اللہ۔

مرشدِ محترم!

آپ کی تحریر نے ہمیں یہ بھی سکھایا کہ تسلیم کمزوری نہیں؛ یہ وہ طاقت ہے جو انسان کو اپنے رب کے فیصلوں کے ساتھ ہم آہنگ کر دیتی ہے۔ جب دل یہ مان لے کہ جو ہوا، اسی میں بھلائی تھی، تو پھر دل ٹوٹتا نہیں — کھل جاتا ہے، روشنی قبول کرنے لگتا ہے۔

ہم شکر گزار ہیں کہ آپ نے ہمیں یہ کتاب عطا کی — مگر اس سے بڑھ کر یہ راستہ دکھایا: رضا کا، فنا کا، اور پھر بقا کا۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اس امانت کو صرف کتاب کے اوراق میں نہیں رکھیں گے، اسے اپنے کردار، اپنے عمل، اپنے اخلاق اور اپنی خاموشی میں زندہ رکھیں گے۔

ایک بیٹے اور ایک عقیدت مند کی حیثیت سے عرض ہے کہ یہ کتاب ہمیں صرف پڑھنے کو نہیں ملی بلکہ ہمیں اپنے اندر جھانکنے کا حوصلہ دے گئی۔ اگر کسی دل میں نرمی اتری ہے تو یہ آپ کی نیت کے نور، آپ کے صبر کی خوشبو اور آپ کی روحانی نسبت کی برکت ہے۔ آپ کی یہ تحریر ہمیں یاد دلاتی ہے کہ کچھ رشتے وقت سے بڑے ہوتے ہیں، کچھ یادیں آنسو نہیں مانگتیں، وہ دعا، شکر اور صبر میں زندہ رہتی ہیں۔ کچھ لوگ بچھڑ کر بھی بچھڑتے نہیں، وہ یاد بن کر دعا میں اترتے ہیں۔

اللہ کریم آپ کو سلامت رکھے، آپ کے قلم کو نور بنائے، اور ہمیں ایسے مرشد عطا کرے جو دکھ کو بھی حکمت میں بدلنا سکھا دیں، اور اسکو روح کی روشنی میں بدلنے کا ہنر سکھا دیں۔ اور آپ کے قلم کو ایسا ذکر بنا دے جو پڑھنے والے کو خود سے نکال کر حقیقت کے قریب لے جائے۔

اللہ کریم سے دعا ہے کہ آپ کے دل کو مزید سکون اور نور عطا فرمائے، اور ماں جی ثمینہ کو اس بقا میں جگہ دے جہاں جدائی باقی نہیں رہتی، صرف نسبت باقی رہتی ہے۔

ہمیشہ آپ کی دعا کے محتاج،

ہمیشہ آپ کی نسبت پر نازاں

آپ کا عقیدت مند

آپ کا بیٹا

ہارون الرشید

"مہر و وفا کے مینار — پدر، مادر اور دختر"

میرے پیارے بابا!

— آپ نے اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے، وہ محض سیاہی سے لکھے ہوئے الفاظ نہیں
یہ دعا کرتے ہوئے ہاتھوں کی لرزش ہے،
یہ دھڑکتے ہوئے دل کی سرگوشی ہے،
یہ روح کی گہرائی سے اٹھنے والی وہ صدا ہے جو میری روح تک سیراب کر کے ہم نوا ہو جاتی ہے۔

آپ نے خیالات کو صرف لفظوں میں نہیں ڈھالا، آپ نے جذبات کو سجا کر انہیں ایک باوقار، پراسرار اور ادبی تحریر میں سمو دیا۔ یہ کتاب ایک ایسی **بہادر اور پروقار شخصیت کا آئینہ** ہے جو یہ اعلان کرتی ہے کہ مشرق ہو یا مغرب، تہذیب کبھی بھی تربیت پر غالب نہیں آسکتی۔ اصل طاقت نہ نام و نمود میں ہے نہ ظاہری چمک دمک میں، اصل طاقت اقدار میں ہے — وہ اقدار جو اس کتاب کے ہر صفحے سے خوشبو کی طرح اٹھتی ہیں۔

آپ نے اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے، وہ محض الفاظ کا مجموعہ نہیں، یہ دل سے نکلنے والی وہ دھڑکن ہے جو میرے دل تک آ کر ہم آواز ہو جاتی ہے۔ آپ نے اس کتاب میں خیالات کو الفاظ اور جذبات کو ایسا پیرہن دیا ہے کہ یہ کتاب ایک ایسی **بہادر اور پروقار شخصیت کا آئینہ** بن گئی ہے جو یہ اعلان کرتی ہے کہ مشرق ہو یا مغرب، تہذیب کبھی بھی تربیت پر غالب نہیں آسکتی۔ اصل طاقت اقدار میں ہوتی ہے، اور یہی اقدار اس کتاب کے ہر صفحے سے خوشبو کی طرح اٹھتی اور جھلکتی ہیں۔

ایک بیٹی کی حیثیت سے یہ کتاب میرے لیے کتاب نہیں،
یہ ہمت کی دستار ہے،
حوصلے کی چادر ہے،
اور کردار کی بلند چوٹی ہے۔

ایک بیٹی کی حیثیت سے یہ کتاب میرے لیے صرف ایک تحریر نہیں، بلکہ ہمت، حوصلے اور کردار کی ایک عظیم مثال ہے۔
— آپ نے لفظ نہیں لکھے
آپ نے اپنے باطن کی روشنی کو صفحات پر بسا دیا۔
آپ کے لہجے میں وہی وقار ہے جو باپ کے سائے میں محسوس ہوتا ہے،
وہی اعتماد ہے جو بیٹی کو اپنے بابا کے وجود سے ملتا ہے،
اور وہی نرمی ہے جو ماں کے آنچل کے لمس سے نصیب ہوتی ہے۔
— یہ کتاب میرے لیے صرف کتاب نہیں
یہ باپ کے بلند کردار کی روشنی،

ماں کی دعا کا حصار،
اور بیٹی کے وجود کی شناخت ہے۔

آپ نے خیالوں کو لفظ میں نہیں ڈالا، بلکہ اپنی روح کو صفحوں پر بسا دیا ہے۔ آپ کی تحریر میں وہی وقار ہے جو باپ کے سائے میں محسوس ہوتا ہے، وہی اعتماد ہے جو بیٹی کو اپنے بابا کے وجود سے ملتا ہے، اور وہی نرمی ہے جو ماں کے آنچل کے لمس سے نصیب ہوتی ہے۔

—ایک بیٹی ہونے کے ناطے یہ کتاب میرے لیے صرف ایک کتاب نہیں
یہ میرے لیے باپ کے بلند کردار کی روشنی ہے،
ماں کی دعا کا حصار ہے،
اور بیٹی کے وجود کی شناخت ہے۔

یہ تحریر مجھے بتاتی ہے کہ اصل تربیت، اصل تہذیب اور اصل عظمت کردار سے جنم لیتی ہے۔ زمین کی حدیں بدلتی رہتی ہیں، نقشے مٹتے اور بنتے رہتے ہیں، مگر وہ گھر کبھی نہیں بدلتا جسے ماں کی دعا اور باپ کے سائے نے بسایا ہو۔ اقدار صرف پڑھی نہیں جاتیں، انہیں جیا جاتا ہے، نبھایا جاتا ہے، اور نسلوں کے دلوں میں محفوظ کیا جاتا ہے۔

—ثمینہ ماں
یہ صرف ایک نام نہیں، ایک پوری کائنات کا احساس ہے۔
ان کی زندگی نے ہمیں دکھایا کہ دین اور دنیا کا توازن کیسا ہوتا ہے۔
— انسان اگر چاہے تو اللہ کی مخلوق
— پرندوں، انسانوں اور ہر ذی روح
سب کے ساتھ ایسا برتاؤ کر سکتا ہے کہ اشرف المخلوقات ہونے کا حق ادا ہو جائے۔
کچھ رشتے جسم کے بغیر بھی قائم رہتے ہیں،
کچھ لوگ بچھڑ کر بھی ساتھ رہتے ہیں۔

اس کتاب نے مجھے یہ سکھایا ہے کہ اصل تربیت، اصل تہذیب اور اصل عظمت کردار سے جنم لیتی ہے۔ مشرق ہو یا مغرب، زمین کا ٹکڑا بدل سکتا ہے، مگر وہ گھر کبھی نہیں بدلتا جسے ماں کی دعا اور باپ کے سائے نے بسایا ہو۔ آپ نے یہ ثابت کر دیا کہ اقدار صرف پڑھائی نہیں جاتیں، انہیں جیا جاتا ہے، نبھایا جاتا ہے، اور نسلوں تک منتقل کیا جاتا ہے۔

ثمینہ ماں نے دنیا، دین اور رشتوں کو جس توازن کے ساتھ سنبھالا، وہ محض بیان نہیں بلکہ ایک زندہ نمونہ ہے۔ انکی زندگی یہ گواہی دیتی ہے کہ انسان اگر چاہے تو اللہ کی مخلوق—پرندوں، انسانوں اور ہر ذی روح—کے ساتھ ایسا سلوک کر سکتا ہے جو واقعی اشرف المخلوق ہونے کا حق ادا کرے۔ انہوں نے ماں ہونے کے معنی سمجھائے، بیٹی کو بیٹی بننا سکھایا، اور باپ کے رتبے کی عظمت کو اور روشن کیا۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ روحانیت صرف عبادت گاہوں تک محدود نہیں رہتی، یہ بچے کے سر پر ہاتھ رکھنے، پرندوں کو دانہ ڈالنے، اور ہر جیتے جاگتے وجود سے محبت کرنے میں بھی جھلکتی ہے۔ انہوں نے

سکھایا کہ اللہ کی مخلوق سے محبت کرنا ہی دراصل اشرف المخلوقات ہونے کا حق ادا کرنا ہے۔ اور یہ ایک خاموش اعلان ہے کہ روحانیت صرف عبادت تک محدود نہیں، بلکہ رویّوں، نیتوں اور عمل میں ظاہر ہوتی ہے۔

ثمینہ ماں نے سکھایا کہ روحانیت صرف سجدوں کا نام نہیں،
یہ نرم لہجوں، پاک نیتوں اور نرم رویّوں میں بھی جھلکتی ہے۔
کسی کے سر پر ہاتھ رکھ دینا بھی عبادت ہے،
کسی ٹوٹے دل کو سہارا دینا بھی سجدے سے کم نہیں۔
میں نے "ثمینہ ماں" کو اپنی دعا میں محسوس کیا،
اپنی سوچ میں پایا،
اپنے کنارے پر بیٹھا ہوا جانا۔

— "ثمینہ ماں"
صرف ایک نام نہیں، ایک پوری دنیا کا احساس ہے۔
میں نے "ثمینہ ماں" کو اپنی دل و دماغ میں، اپنی سوچ میں، اپنے ساتھ پایا ہے۔

یہ کتاب مجھے بار بار اس کمی کا احساس دلاتی رہی جسے رشتوں کی زبان میں "ماں" کہا جاتا ہے۔ دنیا میں ملاقات نہ ہو سکی، مگر روح نے کبھی جدائی قبول — نہیں کی۔ کچھ تعلقات ایسے ہوتے ہیں جو جسم کے بغیر بھی قائم رہتے ہیں۔ ان سے نہ مل پانے کا دکھ ضرور ہے، مگر آخرت کی امید نے اسے روشنی میں بدل دیا ہے۔

یہ کتاب مجھے بار بار یہ احساس دلاتی رہی کہ ہم اس دنیا میں کن رشتوں کی کمی محسوس کرتے ہیں، اور کن ملاقاتوں کی حسرت دل میں لیے پھرتے ہیں۔ اس دنیا میں اپنی "روحانی ماں"، اپنی استاد سے ملاقات نصیب نہ ہو سکی، مگر آخرت کے لیے تو دروازہ کھلا ہے۔ کچھ لوگ بچھڑ کر بھی آپ سے کبھی دور نہیں جا سکتے میں نے "ثمینہ ماں" کو ہمیشہ اپنے درمیان پایا ہے۔

— یہ کتاب مجھے تیاری کا راستہ دکھاتی ہے
وہ تیاری جو دل کو پاک کرتی ہے،
زندگی کو قرآن کی طرف لوٹاتی ہے،
اور اللہ سے ملاقات کی خواہش کو یقین میں بدل دیتی ہے۔

— آپ کے لفظ میرے لیے محض عبارت نہیں
یہ باپ کی نصیحت،
ماں کی دعا،

اور بیٹی کے سر پر رکھا ہوا وہ ہاتھ ہیں
جس سے دنیا کے سارے خوف مٹ جاتے ہیں۔

آپ کے لکھنے کا انداز، لفظوں کا چناؤ اور احساسات کی پاکیزگی نے مجھے زندگی کو نئے زاویے سے دیکھنے کا موقع دیا۔ آپ کی تحریر شور نہیں مچاتی، یہ تحریر چیختی نہیں، واویلا نہیں کرتی، یہ دل کے دروازے پر چپ چاپ دستک دیتی ہے، بلکہ خاموشی سے دل میں اترتی ہے، دل کھل جائے تو اندر جا کر بیٹھ جاتی ہے، اور وہاں اپنی جگہ بنا لیتی ہے۔ اور پھر انسان کو بدلنے کے لیے چیختی نہیں—بولتی بھی نہیں بس اندر سے جگا دیتی ہے۔ یہ وہ تحریر ہے جو پڑھنے والے کو بدلنے کا دعویٰ نہیں کرتی، بلکہ اسے سوچنے، جھکنے اور سنورنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

یہ کتاب ختم ہو جاتی ہے،
مگر اس کا احساس ختم نہیں ہوتا۔
یہ دل میں سوال چھوڑ جاتی ہے،
راستہ دکھا جاتی ہے،
اور ایک ذمہ داری سونپ دیتی ہے:
کہ ہم اپنی زندگی کو قرآن کی روشنی میں کیسے سنواریں،
ہم نے بھی قرآن سے اپنا رشتہ جینا ہے
ہم وہ انسان کیسے بنیں جس پر اللہ کو فخر ہو۔
یہ تحریر امید نہیں—یقین عطا کرتی ہے۔
یقین کہ اللہ ضرور ملائے گا،
اور انشاءاللہ ضرور ملائے گا۔

اب یہ تحریر مجھے تیاری کا راستہ دکھاتی ہے—وہ تیاری جو اللہ اور اس کے قرآن پر عمل سے ہوتی ہے، تاکہ دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی نصیب ہو۔ یہاں بات صرف امید کی نہیں، بلکہ پختہ یقین کی ہے۔ یہ یقین کہ اللہ ضرور ملائے گا، اور انشاءاللہ ضرور ملائے گا۔ یہ کتاب اسی یقین کو دل میں اتارتی ہے، اور انسان کو شک سے نکال کر یقین کے مضبوط مقام پر لا کھڑا کرتی ہے۔

بابا!
ہماری طرف سے دل کی گہرائیوں سے دعا ہے کہ
اور آپ کا سایہ ہمیشہ اسی طرح مسکراتا ہوا ہمارے سروں پر قائم رکھے۔
اللہ کریم "ثمینہ ماں" کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے،
ان کی قبر کو نور سے بھر دے،
اور ہمیں وہاں ملنے کی توفیق عطا فرمائے جہاں نہ جدائی ہو گی نہ آنسو۔
اور ہمیں اس قابل بنا دے کہ ہم ان سے جنت میں مل سکیں۔

ہم دل کی گہرائی سے شکر گزار ہیں کہ اپ نے یہ پر سوز تحریر سے ہمیں نوازا، اللہ کریم اپ کو ہمیشہ سلامت رکھے، اپ کی تحریر میں مزید نور اور برکت عطا فرمائے آمین۔

ہمیشہ آپ کی دعاؤں کی طلب گار،
آپ کی بیٹی
روزینہ

چند گزارشات قارئین کے نام

یہ کتاب کسی مثالی دنیا کا خواب نہیں دکھاتی اور نہ ہی ازدواجی زندگی کو مشکلات سے خالی ظاہر کرتی ہے۔ یہ کتاب زندگی کی زمین پر لکھی گئی تحریر ہے — جہاں محبت بھی ہے، اختلاف بھی؛ قربانی بھی ہے، تھکن بھی؛ دعا بھی ہے اور آنسو بھی۔

ازدواجی زندگی اسلام میں محض ایک سماجی معاہدہ نہیں بلکہ ایک روحانی ذمہ داری ہے۔ یہ ذمہ داری دو افراد کے درمیان نہیں، بلکہ اللہ کے حضور طے پاتی ہے۔ اسی لیے اسلام شادی کو سکون، رحمت اور محبت کا ذریعہ قرار دیتا ہے، نہ کہ محض ضرورت کی تکمیل۔

اس کتاب کے صفحات میں آپ کو:

رسولِ اکرم ﷺ اور امہات المؤمنینؓ کی سیرت کی روشنی

اسلامی تاریخ کے درخشاں نمونے

فکری و روحانی شخصیات کے تجربات

اور ایک عام مگر سچے گھر کی خاموش کہانی ملے گی۔

یہ کتاب نہ مرد کے خلاف ہے، نہ عورت کے خلاف۔

یہ رشتے کے حق میں ہے۔

یہ الزام نہیں، اصلاح کی دعوت ہے۔

یہ شکایت نہیں، شکر کی طرف سفر ہے۔

اس کتاب کا مقصد یہ باور کرانا ہے کہ:

کامیاب ازدواجی زندگی حالات سے نہیں بنتی،

کردار سے بنتی ہے۔

اگر یہ کتاب کسی ایک گھر میں بھی:

تلخی کم کر دے

دعا کو زندہ کر دے

یا خاموشی کو معنی دے دے

تو یہی اس کی سب سے بڑی کامیابی ہو گی۔

یہ تحریر آٹھ برس کے صبر، مشاہدے اور دعا کے بعد قلم بند ہوئی۔ اگر اس میں کوئی خیر ہے تو وہ اللہ کی طرف سے ہے، اور اگر کوئی کمی ہے تو وہ انسانی کمزوری کا نتیجہ۔

اللہ اس کتاب کو قبول فرمائے، نفع بخش بنائے اور گھروں کو سکون عطا فرمائے۔

آمین۔

فہرستِ ابواب

باب اوّل
شوہر کی کامیابی اور قلبی سکون میں بیوی کا کردار
امہات المؤمنینؓ اور اسلامی تاریخ کی روشنی میں —

باب دوم
خاندان کی بنیاد میں شوہر کا کردار
قیادت، عدل، محبت اور ذمہ داری —

باب سوم
ازدواجی تعلق میں باہمی مشاورت اور اختلاف کا حسن
فہم، برداشت اور محبت کے ساتھ جینے کا قرآنی طریقہ —

باب چہارم
دعا، صبر اور شکر
کامیاب ازدواجی زندگی کے روحانی ستون —

باب پنجم
اولاد کی تربیت میں میاں بیوی کی مشترکہ ذمہ داری
نسلوں کی تعمیر اور کردار سازی —

باب ششم
ازدواجی زندگی میں آزمائشیں، صبر اور بحالی
ٹوٹنے سے پہلے سنبھل جانا —

اختتامی باب
کامیاب ازدواجی زندگی
سکون، محبت اور قربِ الٰہی تک پہنچنے کا اسلامی راستہ —

باب اوّل

شوہر کی کامیابی اور قلبی سکون میں بیوی کا کردار

امہات المؤمنینؓ، اسلامی تاریخ اور فکری ورثے کی روشنی میں ایک جامع فکری و روحانی مطالعہ

اسلامی معاشرہ فرد سے نہیں بلکہ خاندان سے تشکیل پاتا ہے، اور خاندان کی بنیاد ازدواجی رشتہ ہے۔ یہ رشتہ محض جسمانی یا معاشی ضرورت کا نام نہیں بلکہ سکونِ قلب، محبت، رحمت، اعتماد اور مقصدِ حیات کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ اسلام نے نکاح کو محض سماجی معاہدہ نہیں بلکہ عبادت، سکون اور رحمت کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ قرآنِ مجید ازدواجی زندگی کے مقصد کو یوں واضح کرتا ہے: قرآنِ مجید نے ازدواجی تعلق کو اپنی نشانیوں میں شمار کرتے ہوئے فرمایا:
وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ
اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اُس نے تمہارے لیے تم ہی میں سے جوڑے بنائے تاکہ تم اُن سے سکون حاصل کرو، اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا فرمادی۔ (الروم:21)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ شادی کا بنیادی مقصد سکون ہے، اور یہ سکون اس وقت پیدا ہوتا ہے جب میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے لباس بن جائیں؛ ایک دوسرے کی کمزوریوں کو ڈھانپنے والے، ایک دوسرے کے غم کے ساتھی، اور ایک دوسرے کی طاقت بننے والے۔

اسلامی تاریخ میں ہمیں ازدواجی زندگی کی مثالی صورتیں رسولِ اکرم ﷺ اور امہات المؤمنینؓ کی سیرتِ طیبہ میں نظر آتی ہیں۔ یہ وہ نورانی مینار ہیں جن سے آج کی ازدواجی تاریکیوں میں بھی روشنی حاصل کی جاسکتی ہے۔

یہ سکون محض ظاہری آسائش سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ دلوں کے اطمینان، روحوں کے اتصال اور مقاصد کے اشتراک سے جنم لیتا ہے۔ اسلامی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ عظیم مردوں کی عظمت کے پس منظر میں اکثر ایک عظیم عورت کا کردار ہوتا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ اور امہات المؤمنینؓ کی زندگیاں اسی حقیقت کی روشن دلیل ہیں۔

کامیابی گھر سے شروع ہوتی ہے

اسلامی تاریخ اور فکری ورثہ اس حقیقت کی تصدیق کرتا ہے کہ مرد کی کامیابی کا پہلا مدرسہ اس کا گھر ہوتا ہے۔ پُرسکون گھر مضبوط قائد، مفکر اور انسانیت کے خادم پیدا کرتا ہے۔ یہ سکون محض سہولت سے نہیں آتا بلکہ محبت، رحمت، صبر، دعا اور حکمت سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ عورت جو اپنے شوہر کے لیے دعا کا حصار بن جائے، وہی اس کی اصل کامیابی کی ضامن ہوتی ہے۔

ازدواجی سکون: اسلامی تصور

اسلام میں شادی کا بنیادی مقصد سکونِ قلب ہے، نہ کہ صرف معاشی یا جسمانی ضرورت کی تکمیل۔ میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے لباس ہیں؛ ایک دوسرے کی کمزوریوں کو ڈھانپنے والے، غم کے لمحوں میں سایہ بننے والے اور آزمائش کے وقت مضبوط سہارا۔

حضرت خدیجہؓ: ایمان، وفا اور جذباتی استقامت

حضرت خدیجہؓ: ایمان، وفا اور جذباتی استقامت کی لازوال مثال

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا نام آتے ہی وفا، قربانی، فہم اور استقامت کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے۔ وہ صرف رسول اللہ ﷺ کی شریکِ حیات ہی نہیں تھیں بلکہ آپ ﷺ کے لیے جذباتی سکون، فکری اعتماد، عملی قوت اور عملی سہارا تھیں۔ اسلامی تاریخ میں ازدواجی رفاقت کی سب سے بلند مثال ہیں۔ جب غارِ حرا میں پہلی وحی نازل ہوئی اور رسول اللہ ﷺ پر خوف و ہیبت کے آثار طاری تھے، خوف اور اضطراب کی کیفیت میں گھر تشریف لائے تو حضرت خدیجہؓ نے جو تسلی دی، وہ محض جذباتی ہمدردی نہ تھی بلکہ ایک بصیرت افروز اعلانِ یقین تھا۔ حضرت خدیجہؓ نے وہ تاریخی الفاظ کہے جنہوں نے نبوت کے سفر کو استقامت بخشی، انہوں نے کردار کی بنیاد پر نبوت کی تصدیق کی اور دنیا کی پہلی مؤمنہ بنیں:
ہر گز نہیں!! اللہ آپ کو ضائع نہیں کرے گا۔ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کے راستے میں مدد کرتے ہیں۔

یہ محض تسلی نہیں تھی، یہ ایک بیوی کی جذباتی ذہانت کا مظہر تھا۔ حضرت خدیجہؓ نے خوف کے لمحے میں یقین کا چراغ جلایا، اور شک کے اندھیرے میں اعتماد کی شمع روشن کی۔ انہوں نے نہ صرف سب سے پہلے ایمان قبول کیا بلکہ اپنی ساری دولت، عزت اور حیثیت رسول اللہ ﷺ کے مشن پر قربان کر دی۔ انہوں نے اپنی دولت، عزت اور سماجی حیثیت رسول اللہ ﷺ کے مشن پر بے لوث قربان کر دی۔ شعبِ ابی طالب کے کٹھن ایام ہوں یا معاشی و سماجی بائیکاٹ ہو یا مکہ کے طعن و تشنیع، حضرت خدیجہؓ ہر آزمائش میں ثابت قدم رہیں۔ یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ بیوی کا جذباتی استحکام شوہر کو مقصد، قیادت اور خدمت پر توجہ دینے کے قابل بناتا ہے۔ حضرت خدیجہؓ کی رفاقت نے رسول اللہ ﷺ کو وہ داخلی سکون عطا کیا جس سے ایک عالمگیر انقلاب کی بنیاد پڑی۔

حضرت عائشہؓ: علم، فہم اور فکری رفاقت

حضرت عائشہؓ: علم، فہم اور فکری رفاقت کی مثال

اسلام جذبات کے ساتھ ساتھ علم اور مشاورت کو بھی ازدواجی زندگی کا ستون قرار دیتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس پہلو کی عظیم مثال ہیں۔ اگر حضرت خدیجہؓ جذباتی سکون اور استقامت کی علامت ہیں تو حضرت عائشہؓ علم، فہم اور فکری بصیرت کی عظیم مثال ہیں۔ اسلام ازدواجی زندگی میں مشاورت، علم اور شعور کو فروغ دیتا ہے۔ ایک عقلمند بیوی شوہر کو فکری توازن، اخلاقی وضاحت اور انصاف پر مبنی فیصلہ سازی عطا کرتی ہے۔
حضرت عائشہؓ کی رفاقت نے اسلامی معاشرے میں علم، سوال اور شعور کی روایت کو مضبوط کیا۔ حضرت عائشہؓ نہ صرف رسول اللہ ﷺ کی زوجہ تھیں بلکہ امت کی معلمہ بھی تھیں۔ قرآن، حدیث، فقہ، طب، تاریخ اور انسانی نفسیات پر ان کی گہری گرفت نے انہیں اسلامی تاریخ کا ایک درخشاں باب بنا دیا۔

ایک عقلمند بیوی شوہر کے لیے صرف جذباتی سہارا نہیں ہوتی بلکہ وہ اس کی فکری توازن، اخلاقی وضاحت اور انصاف پر مبنی قیادت کی بنیاد بھی بنتی ہے۔
حضرت عائشہؓ کی موجودگی میں رسول اللہ ﷺ کا گھر علم و حکمت کا مرکز تھا۔ قرآن، حدیث، فقہ، تاریخ اور انسانی نفسیات پر ان کی گہری بصیرت نے

انہیں امت کی معلمہ بنا دیا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی شریکِ حیات ہی نہیں بلکہ فکری ساتھی بھی تھیں۔ ان کا علم آنے والی نسلوں کے لیے روشنی کا مینار بن گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں بڑے مفکر، قائد اور مصلح ایسے گھروں سے نکلے جہاں عورت علم اور شعور کی امین تھی۔

نیک بیوی کا قرآنی تصور

قرآن نیک بیوی کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللَّهُ۔(النساء:34)

نیک بیویاں فرمانبردار ہوتی ہیں اور شوہر کی غیر موجودگی میں اللہ کے حکم سے حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں۔(النساء:34)

یہ حفاظت صرف مال و عزت کی نہیں بلکہ رشتے، اعتماد اور سکون کی بھی ہے۔ صالح بیوی شوہر کی عزت کی محافظ بھی ہوتی ہے اور اس کے سکون کی نگہبان بھی۔ وہ کامیابی کے لمحے میں غرور سے بچاتی ہے اور ناکامی کے وقت حوصلہ عطا کرتی ہے۔

اسلامی تعلیمات اور سیرتِ امہات المؤمنینؓ کی روشنی میں صالح بیوی کی چند نمایاں خصوصیات یہ ہیں:

ایک نیک بیوی شوہر کی کامیابی پر غرور نہیں آنے دیتی اور ناکامی پر مایوسی کو قریب نہیں پھٹکنے دیتی۔ وہ تنقید کے بجائے خود احتسابی کا آئینہ بنتی ہے۔ اس کی خاموش دعائیں شوہر کی تقدیر کو سنوار دیتی ہیں۔

صالح بیوی:

شوہر کی عزت اور سکون دونوں کی محافظ ہوتی ہے

مشکل میں صبر اور حوصلہ عطا کرتی ہے

کامیابی میں اللہ کی یاد اور مشکل میں صبر کی تلقین کرتی ہے۔

وہ تنقید کا ہتھیار نہیں بلکہ خود احتسابی کا آئینہ بنتی ہے۔

اس کی خاموش دعائیں شوہر کی تقدیر کو سنوارتی ہیں۔

وہ شکایت نہیں بلکہ شکر کا مزاج پیدا کرتی ہے۔

یہ کردار بظاہر خاموش ہوتا ہے، مگر اثر میں انقلابی۔

یہ خاموش کردار ہی دراصل مرد کے باطن کو مضبوط بناتا ہے۔

ذاتی عکاسی: سیرت سے زندگی تک

امہات المؤمنینؓ کی سیرت سے یہ راز عیاں ہوتا ہے کہ خالص عشق، مسلسل صبر اور خاموش دعا گھروں کو جنت کا نمونہ بنا دیتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس نے میرے گھر کو بھی سکون کا گہوارہ بنایا۔ آٹھ برس گزرنے کے بعد جب اللہ نے توفیق عطا کی تو میں نے اس دل کے خوشگوار بوجھ کو قلم کے سپرد کیا، تاکہ یہ تحریر محض الفاظ نہ رہے بلکہ ایک دعوتِ فکر بن جائے۔

کامیابی کا آغاز گھر سے

ازدواجی زندگی میں کامیابی کا راز دولت، حیثیت یا شہرت نہیں بلکہ کردار، نیت اور دعا میں پوشیدہ ہے۔ اسلام نے عورت کو مرد کی کمزوری نہیں بلکہ اس کی طاقت بنایا ہے۔ جب بیوی حضرت خدیجہؓ کی طرح وفا اور استقامت کا پیکر ہو، حضرت عائشہؓ کی طرح علم و فہم کی امین ہو، اسلامی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ مرد کی کامیابی کا پہلا مدرسہ اس کا گھر ہوتا ہے۔ پُرسکون گھر مضبوط قائد، مفکر اور انسانیت کے خادم پیدا کرتا ہے۔ یہ سکون دولت سے نہیں بلکہ: محبت، رحمت، صبر، دعا، حکمت سے پیدا ہوتا ہے۔ یقیناً کامیابی گھر سے شروع ہوتی ہے اور گھر عورت کے کردار سے بنتا ہے۔

باب دوم

خاندان کی بنیاد میں شوہر کا کردار

قیادت، عدل، محبت اور ذمہ داری کی روشنی میں

اگر بیوی گھر کے سکون کی محافظ ہے تو شوہر اس سکون کا معمار ہے۔ اسلام نے ازدواجی زندگی میں مرد کو محض کفیل یا حاکم نہیں بلکہ ذمہ دار، نگہبان اور قائد بنایا ہے۔ شوہر کا کردار خاندان کی فکری سمت، اخلاقی فضا اور روحانی کیفیت کا تعین کرتا ہے۔

قرآنِ مجید شوہر کی ذمہ داری کو واضح کرتے ہوئے فرماتا ہے:

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِبِمَافَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ وَبِمَاأَنفَقُوامِنْ أَمْوَالِهِمْ(النساء:34)

مرد عورتوں پر ذمہ دار ہیں، اس وجہ سے کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے کہ وہ اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔

یہ فضیلت اختیار نہیں بلکہ ذمہ داری ہے، اور یہ ذمہ داری عدل، محبت اور تقویٰ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

شوہر: حاکم نہیں، محافظ

اسلامی تصورِ شوہریت میں مرد جابر نہیں بلکہ رحمت والا قائد ہے۔ وہ حکم چلانے والا نہیں بلکہ مثال قائم کرنے والا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو، اور میں اپنے گھر والوں کے لیے تم سب سے بہتر ہوں۔

یہ حدیث شوہر کے کردار کا معیار متعین کر دیتی ہے۔ بہترین شوہر وہ نہیں جو باہر کی دنیا میں کامیاب ہو، بلکہ وہ ہے جو گھر میں امن، عزت اور سکون فراہم کرے۔

رسول اللہ ﷺ بطور شوہر: عملی نمونہ

نبی کریم ﷺ کی ازدواجی زندگی مردوں کے لیے کامل نمونہ ہے۔ آپ ﷺ نے کبھی سخت لہجہ اختیار نہیں کیا، کبھی تذلیل نہیں کی، کبھی کمزوری کو ہتھیار نہیں بنایا۔

آپ ﷺ:

گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے

بیویوں کی بات توجہ سے سنتے

ان کے جذبات کی قدر کرتے

اختلاف میں بھی وقار اور عدل کا دامن نہیں چھوڑتے

یہ وہ قیادت تھی جو محبت سے دل جیتتی ہے، خوف سے نہیں۔

شوہر کا عدل: ازدواجی زندگی کی ریڑھ کی ہڈی

عدل شوہر کے کردار کی اساس ہے۔ عدل صرف مالی معاملات تک محدود نہیں بلکہ:

وقت میں عدل

توجہ میں عدل

رویے میں عدل

فیصلوں میں عدل

شامل ہے۔

رسول اللہ ﷺ عدل میں اس قدر محتاط تھے کہ معمولی سی ناہمواری پر بھی دعا کرتے:

"اے اللہ! جو میرے اختیار میں نہیں، اس پر مجھے ملامت نہ فرمانا۔"

یہ احساسِ جواب دہی شوہر کے کردار کو متوازن بناتا ہے۔

شوہر کا اخلاقی کردار

شوہر گھر کا پہلا معلم ہوتا ہے۔ اس کے رویے سے:

بچوں کا مزاج بنتا ہے

بیوی کا اعتماد پروان چڑھتا ہے

گھر کا ماحول تشکیل پاتا ہے

اگر شوہر:

نرم گفتار ہو

برداشت والا ہو

شکر گزار ہو

اللہ پر توکل رکھتا ہو

تو گھر عبادت گاہ بن جاتا ہے۔

محبت کا اظہار: مردانگی کے خلاف نہیں

اسلام میں محبت کا اظہار کمزوری نہیں بلکہ سنت ہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنی بیویوں کے ساتھ محبت کا اظہار کرتے، دوڑ کا مقابلہ کرتے، مسکراہٹ بانٹتے، اور خوشی کے لمحات کو قید نہیں کرتے تھے۔

ایک ایسا شوہر جو محبت کا اظہار کرنا جانتا ہو، وہ:

بیوی کے دل میں تحفظ پیدا کرتا ہے

اختلافات کو کم کرتا ہے

تعلق کو بوجھ نہیں بننے دیتا

شوہر کی خاموش ذمہ داریاں

بسا اوقات شوہر کا اصل کردار خاموشی میں ظاہر ہوتا ہے:

بیوی کی عزت کا دفاع

اس کی کمزوریوں کو چھپانا

اس کے خوابوں کو کچلنے کے بجائے سہارا دینا

اس کی رائے کو اہمیت دینا

یہ سب وہ اعمال ہیں جو زبان سے نہیں، کردار سے ادا ہوتے ہیں۔

بیوی کی عزت، شوہر کی عظمت

اسلامی تاریخ بتاتی ہے کہ جن مردوں نے اپنی بیویوں کو عزت دی، تاریخ نے انہیں عزت دی۔ اور جنہوں نے ظلم کیا، وہ اپنے گھروں سمیت بکھر گئے

شوہر کی عظمت کا پیمانہ:

اس کا عہدہ نہیں

اس کی دولت نہیں

بلکہ اس کا گھریلو کردار ہے

شوہر اور دعا

جس طرح بیوی کی دعائیں شوہر کی تقدیر بدلتی ہیں، اسی طرح شوہر کی دعائیں گھر کو محفوظ بناتی ہیں۔ وہ شوہر جو:

بیوی کے لیے دعا کرتا ہے

اولاد کے لیے دعا کرتا ہے

گھر کو اللہ کے سپرد کرتا ہے

وہ دراصل اپنی قیادت کو ربانی تحفظ میں دے دیتا ہے۔

فکری و روحانی قیادت

شوہر محض نان نفقہ دینے والا نہیں بلکہ:

فکری سمت دینے والا

روحانی ماحول قائم کرنے والا

اخلاقی حدود متعین کرنے والا

ہوتا ہے۔

وہ گھر جہاں شوہر نماز، صدق، صبر اور شکر کا عملی نمونہ ہو، وہاں نصیحت کی ضرورت کم پڑتی ہے۔

اختتامی تاثر

ایک کامیاب شوہر وہ نہیں جو سب کچھ جانتا ہو، بلکہ وہ ہے جو:

سیکھنے پر آمادہ ہو
جھکنے کی ہمت رکھتا ہو
اپنی غلطی ماننے کا حوصلہ رکھتا ہو
ایسا شوہر گھر کو قلعہ بناتا ہے، قید خانہ نہیں۔
شوہر خاندان کا محافظ اور قائد ہے
اس کی قیادت محبت اور عدل سے قائم ہوتی ہے
اس کا اخلاق گھر کی فضا متعین کرتا ہے
رسول اللہ ﷺ اس کردار کا کامل نمونہ ہیں

باب سوم

ازدواجی تعلق میں باہمی مشاورت اور اختلاف کا حسن

فہم، برداشت اور محبت کے ساتھ جینے کا قرآنی طریقہ

ازدواجی زندگی کا مطلب دو مختلف ذہنوں، مزاجوں اور پس منظر رکھنے والے انسانوں کا ایک سفر پر گامزن ہونا ہے۔ اس سفر میں اختلاف فطری ہے، مگر اسلام اختلاف کو بگاڑ نہیں بلکہ سنوارنے کا ذریعہ بناتا ہے، بشرطیکہ اس کے ساتھ مشاورت، برداشت اور خیر خواہی شامل ہو۔

قرآنِ مجید اہلِ ایمان کی ایک نمایاں صفت یوں بیان کرتا ہے:

شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ

"اور ان کے کام آپس کی مشاورت سے ہوتے ہیں۔" (الشوریٰ:38)

یہ اصول صرف ریاست یا معاشرے تک محدود نہیں بلکہ سب سے پہلے گھر میں نافذ ہوتا ہے۔

مشاورت: ازدواجی تعلق کی روح

اسلام میں شوہر کو سربراہ ضرور بنایا گیا ہے، مگر آمر نہیں۔ نبی کریم ﷺ اپنی ازواجِ مطہراتؓ سے مشورہ فرماتے، ان کی رائے کو اہمیت دیتے اور بسا اوقات اسی پر عمل بھی کرتے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت امِ سلمہؓ کا مشورہ تاریخِ اسلام کا درخشاں باب ہے۔ ایک بیوی کی فہم و بصیرت نے ایک نازک موقع پر پوری امت کو بحران سے نکال دیا۔ یہ واقعہ واضح کرتا ہے کہ دانشمند بیوی کی رائے خاندان ہی نہیں، تاریخ کا رخ بھی بدل سکتی ہے۔

اختلاف: رحمت یا زحمت؟

اختلاف بذاتِ خود مسئلہ نہیں، اختلاف کا انداز مسئلہ بنتا ہے۔ اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ اختلاف کو:

انا کا مسئلہ نہ بنایا جائے

فتح اور شکست کا میدان نہ سمجھا جائے

بلکہ بہتری کی تلاش کا ذریعہ بنایا جائے

رسول اللہ ﷺ کے گھریلو معاملات اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اختلاف کے باوجود وقار، احترام اور محبت برقرار رکھی جا سکتی ہے۔

اختلاف کے وقت شوہر کا کردار

اختلاف کے لمحے میں شوہر کا کردار فیصلہ کن ہوتا ہے۔ ایک بالغ نظر شوہر:

غصے میں فیصلہ نہیں کرتا

بیوی کی بات مکمل سنتا ہے

اپنی طاقت کا مظاہرہ نہیں بلکہ حکمت کا استعمال کرتا ہے

ایسا شوہر اختلاف کو دیوار نہیں بننے دیتا بلکہ پُل بنا دیتا ہے۔

اختلاف کے وقت بیوی کا کردار

دانشمند بیوی اختلاف کے وقت:

لہجے کی نرمی کو نہیں چھوڑتی

مسئلے کو مسئلہ رکھتی ہے، شخصیت پر حملہ نہیں کرتی

وقت اور موقع کی پہچان رکھتی ہے

وہ جانتی ہے کہ جیت تعلق میں نہیں بلکہ انا میں ہوتی ہے، اور ازدواجی زندگی انا کی نہیں، قربانی کی متقاضی ہے۔

خاموشی بھی مشاورت ہے

ہر بات زبان سے نہیں کہی جاتی۔ بعض اوقات:

خاموشی

تحمل

وقت دینا

یہ سب بھی مشاورت کی صورتیں ہیں۔ اسلام جلد بازی کے بجائے برداشت سکھاتا ہے۔

اختلاف کے بعد تعلق کی بحالی

اسلام ہمیں یہ بھی سکھاتا ہے کہ اختلاف کے بعد:

معافی میں پہل کی جائے

دل صاف رکھا جائے

پرانے زخم نہ کریدے جائیں

ازدواجی زندگی میں اصل خوبصورتی اختلاف نہ ہونے میں نہیں بلکہ اختلاف کے بعد تعلق کو سنبھال لینے میں ہے۔

باب کا خلاصہ

مشاورت ازدواجی زندگی کی روح ہے

اختلاف فطری ہے مگر بگاڑ ضروری نہیں

احترام اور برداشت اختلاف کو حسن بنا دیتے ہیں

رسول اللہ ﷺ اس طرزِ عمل کا کامل نمونہ ہیں

باب چہارم

دعا، صبر اور شکر

کامیاب ازدواجی زندگی کے روحانی ستون

ازدواجی زندگی صرف جذبات اور ذمہ داریوں کا نام نہیں بلکہ ایک روحانی سفر ہے۔ اس سفر میں اگر کوئی چیز میاں بیوی کو جوڑے رکھتی ہے تو وہ دعا، صبر اور شکر ہے۔ یہ تینوں وہ ستون ہیں جن پر ایک مضبوط، پائیدار اور بابرکت گھر قائم ہوتا ہے۔

دعا: رشتوں کی پوشیدہ طاقت

دعا وہ طاقت ہے جو دلوں کو جوڑتی اور تقدیروں کو سنوارتی ہے۔ جب میاں بیوی:

ایک دوسرے کے لیے دعا کرتے ہیں

ایک دوسرے کو اللہ کے سپرد کرتے ہیں

تو رشتہ صرف جذباتی نہیں بلکہ ربانی ہو جاتا ہے۔

بیوی کی خاموش دعائیں اور شوہر کی ذمہ دارانہ التجائیں وہ حفاظت ہیں جو نظر نہیں آتیں مگر اثر رکھتی ہیں۔

صبر: ازدواجی زندگی کا امتحان

کوئی بھی رشتہ آزمائش سے خالی نہیں۔ صبر وہ صفت ہے جو:

تلخی کو زہر بننے سے روکتی ہے

وقتی دکھ کو دائمی نفرت نہیں بننے دیتی

قرآنِ مجید بار بار صبر کی تلقین کرتا ہے، کیونکہ صبر کرنے والے ہی اصل کامیابی پاتے ہیں۔

ازدواجی زندگی میں صبر کا مطلب ظلم سہنا نہیں بلکہ:

وقت دینا

بہتری کی امید رکھنا

اور اصلاح کی کوشش جاری رکھنا ہے۔

شکر: تعلق کی خوشبو

شکر وہ جذبہ ہے جو رشتوں میں مٹھاس پیدا کرتا ہے۔ شکر گزار شوہر:

بیوی کی کوشش کو دیکھتا ہے

اس کی قربانی کو مانتا ہے

اور شکر گزار بیوی:

شوہر کی محنت کو سراہتی ہے

اس کی نیت کی قدر کرتی ہے
شکر شکایت کا دشمن ہے، اور شکایت رشتوں کی قاتل۔

دعا، صبر اور شکر کا باہمی تعلق

یہ تینوں الگ الگ نہیں بلکہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں:
دعا صبر کی طاقت بنتی ہے
صبر شکر کا دروازہ کھولتا ہے
شکر دعا کو قبولیت کے قریب لے جاتا ہے
یوں گھر عبادت گاہ میں بدل جاتا ہے۔

روحانی فضا کا قیام

وہ گھر جہاں:
مشکل میں سجدہ ہوتا ہو
خوشی میں الحمدللہ کہا جاتا ہو
اختلاف میں اللہ کو یاد رکھا جاتا ہو
وہاں سکون نازل ہوتا ہے، چاہے وسائل کم ہی کیوں نہ ہوں۔

باب کا خلاصہ

دعا رشتوں کو رب سے جوڑتی ہے
صبر تعلق کو ٹوٹنے سے بچاتا ہے
شکر محبت کو بڑھاتا ہے
یہی تینوں کامیاب ازدواجی زندگی کے اصل ستون ہیں

باب پنجم

اولاد کی تربیت میں میاں بیوی کی مشترکہ ذمہ داری

نسلوں کی تعمیر، کردار سازی اور روحانی امانت

اولاد محض ماں باپ کی خواہش کا ثمر نہیں بلکہ اللہ کی امانت ہے۔ اسلام اولاد کو نعمت بھی قرار دیتا ہے اور آزمائش بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اولاد کی تربیت کو صرف فطری ذمہ داری نہیں بلکہ دینی فریضہ قرار دیا گیا ہے۔

قرآنِ مجید اس ذمہ داری کی سنگینی کو یوں بیان کرتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ

"اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔" (التحریم:6)

یہ حکم واضح کرتا ہے کہ والدین کی نجات اولاد کی تربیت سے جڑی ہوئی ہے۔

اولاد کی تربیت: ماں یا باپ کی نہیں، دونوں کی ذمہ داری

اسلامی تعلیمات میں تربیت کو صرف ماں کے کھاتے میں ڈال دینا ایک نامکمل تصور ہے۔ نبی کریم ﷺ نے عملی طور پر بتایا کہ باپ بھی تربیت میں اتنا ہی شریک ہے جتنا ماں۔

ماں:

محبت

قربانی

جذباتی وابستگی

کی علامت ہے،

جبکہ باپ:

تحفظ

رہنمائی

حدود

کا استعارہ ہے۔

جب یہ دونوں کردار توازن کے ساتھ ادا ہوں تو اولاد اعتماد، اخلاق اور ایمان کے ساتھ پروان چڑھتی ہے۔

نبی کریم ﷺ بطور مربی اولاد

رسول اللہ ﷺ بچوں کے ساتھ شفقت، احترام اور حکمت کا پیکر تھے۔ آپ ﷺ:

بچوں کو سلام میں پہل کرتے

ان کی بات سنتے

ان کی عزتِ نفس مجروح نہ کرتے

حضرت حسنؓ اور حسینؓ کو کندھوں پر اٹھانا، نماز میں سجدہ طویل کر دینا—یہ سب اس بات کا اعلان ہے کہ اسلام میں تربیت سختی سے نہیں، محبت سے ہوتی ہے۔

میاں بیوی کا باہمی اتفاق: تربیت کی بنیاد

اولاد کی تربیت میں سب سے بڑا نقصان وہاں ہوتا ہے جہاں:

ماں اور باپ ایک دوسرے کو غلط ثابت کرنے لگیں

بچے کے سامنے اختلاف کو ہوا دی جائے

ایک والد نرم ہو اور دوسرا حد سے زیادہ سخت

ایسی صورت میں بچہ الجھن، خوف یا بغاوت کا شکار ہو جاتا ہے۔

اسلامی تربیت کا اصول ہے:

"پہلے میاں بیوی ایک ہوں، پھر اولاد کی اصلاح کریں۔"

ماں کا کردار: شخصیت کی پہلی درسگاہ

ماں بچے کی پہلی معلمہ ہے۔ اس کی:

زبان

لہجہ

صبر

دعا

بچے کی شخصیت میں منتقل ہو جاتے ہیں۔

ایک ماں اگر خود:

سچ بولتی ہے

شکر گزار ہے

نماز سے جڑی ہوئی ہے

تو بچے کو نصیحت کی ضرورت کم پڑتی ہے۔

باپ کا کردار: سمت اور معیار

باپ بچے کے لیے:

کردار کا پیمانہ

انصاف کی مثال

تحفظ کی علامت

ہوتا ہے۔

وہ باپ جو:

وقت دیتا ہے

وعدہ پورا کرتا ہے

غصے میں بھی خود پر قابو رکھتا ہے

وہ اپنے بچوں کو الفاظ سے زیادہ عمل سے تربیت دیتا ہے۔

تربیت میں دعا کا کردار

اسلام میں تربیت کا آغاز دعا سے ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی دعائیں اس کی روشن مثال ہیں:

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا

"اے ہمارے رب! ہمیں ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما۔" (الفرقان:74)

وہ والدین جو اولاد کے لیے دعا کرتے ہیں، دراصل ان کے لیے غیبی مدد طلب کرتے ہیں۔

اخلاق، نہ کہ صرف کامیابی

اسلامی تربیت کا مقصد صرف:

اچھے نمبر، اچھی نوکری، سماجی مقام، نہیں بلکہ:

اچھا انسان، بااخلاق مسلمان، ذمہ دار فرد ہے۔

کردار کے بغیر کامیابی، اسلام کی نظر میں خسارہ ہے۔

دورِ حاضر کے چیلنجز

آج کے دور میں:

موبائل، سوشل میڈیا، مادہ پرستی نے تربیت کو مشکل بنا دیا ہے۔

ایسے میں میاں بیوی کا باہمی اتفاق، نگرانی اور شعور پہلے سے کہیں زیادہ ضروری ہو چکا ہے۔

باب کا خلاصہ

اولاد اللہ کی امانت ہے

تربیت مشترکہ ذمہ داری ہے

محبت اور حدود کا توازن ضروری ہے

والدین کا کردار اولاد کی تقدیر بناتا ہے

باب ششم

ازدواجی زندگی میں آزمائشیں، صبر اور بحالی

ٹوٹنے سے پہلے سنبھل جانا—اسلام کا شفابخش طریقہ

ازدواجی زندگی کسی ہموار شاہراہ کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ایسا سفر ہے جس میں:

کبھی خوشیوں کی بارش ہوتی ہے

کبھی آزمائشوں کی دھوپ

کبھی خاموشی کی سردی

اور کبھی غلط فہمیوں کی آندھی

اسلام اس حقیقت سے انکار نہیں کرتا کہ آزمائشیں آئیں گی، بلکہ وہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ آزمائش میں ٹوٹا نہیں جاتا، نکھرا جاتا ہے۔

قرآنِ مجید فرماتا ہے:

أَحَسِبَ النَّاسُ أَن يُتْرَكُوا أَن يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ

کیا لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ وہ صرف یہ کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے، اور ان کی آزمائش نہیں کی جائے گی؟ (العنکبوت:2)

یہ آزمائشیں انفرادی بھی ہوتی ہیں اور ازدواجی بھی۔

آزمائش: سزا نہیں، پیغام

ازدواجی زندگی میں آنے والی مشکلات ہمیشہ ناکامی کی علامت نہیں ہوتیں۔ بعض اوقات یہ:

غفلت کی یاد دہانی

رویوں کی اصلاح

ترجیحات کی درستگی

کا ذریعہ ہوتی ہیں۔

اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ ہر آزمائش سے پہلے خود سے سوال کیا جائے:

کیا ہم ایک دوسرے کے حق ادا کر رہے ہیں؟

عام ازدواجی آزمائشیں

ہر دور میں کچھ آزمائشیں مشترک رہی ہیں:

مالی تنگی

سسرالی معاملات

توقعات کا ٹکراؤ

وقت کی کمی

بات چیت کا فقدان

یہ مسائل تب بگڑتے ہیں جب:

صبر ختم ہو جائے

گفتگو تلخی میں بدل جائے

اور اللہ کو فیصلوں سے نکال دیا جائے

صبر: خاموش برداشت نہیں، شعوری استقامت

اسلام میں صبر کا مطلب ظلم سہنا نہیں بلکہ:

جذبات کو قابو میں رکھنا

وقتی ردِ عمل سے بچنا

بہتری کی امید کے ساتھ کوشش جاری رکھنا ہے۔

قرآن کہتا ہے:

إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ

"بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" (البقرہ:153)

ازدواجی زندگی میں صبر وہ پل ہے جو ٹوٹتے تعلق کو جوڑ سکتا ہے۔

شوہر کا صبر

شوہر کے لیے صبر کا مطلب:

غصے میں فیصلہ نہ کرنا

بیوی کی کمزوری کو طعنہ نہ بنانا

اپنی قوت کو دباؤ کے بجائے تحفظ کے لیے استعمال کرنا ہے۔

جو شوہر مشکل وقت میں خود کو سنبھال لیتا ہے، وہ دراصل پورے گھر کو سنبھال لیتا ہے۔

بیوی کا صبر:

برداشت کے ساتھ امید رکھنا

شکایت کے بجائے حکمت اختیار کرنا

اور دعا کا دامن نہ چھوڑنا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ بہت سے گھر عورت کے صبر سے بچے، اور بہت سے بکھر گئے جب یہ صبر دعا سے خالی ہو گیا۔

اسلام کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا:

(Reconciliation) بحالی

اسلام ٹوٹنے سے پہلے جڑنے کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن میاں بیوی کے اختلاف میں مصالحت کا واضح راستہ دکھاتا ہے:

وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا إِن يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا

اگر تمہیں ان دونوں کے درمیان جھگڑے کا خوف ہو تو ایک حکم مرد کے خاندان سے اور ایک عورت کے خاندان سے مقرر کرو (النساء:35)

یہ آیت بتاتی ہے کہ:

مسئلے چھپائے نہیں جاتے

بلکہ حکمت سے حل کیے جاتے ہیں

معافی: طاقت کی علامت

اسلام میں معافی کمزوری نہیں بلکہ:

ایمان کی قوت

کردار کی بلندی

اور دل کی وسعت

کی علامت ہے۔

وہ گھر جہاں:

معافی میں پہل ہو

انا قربان ہو

اور تعلق بچانے کو ترجیح دی جائے

وہاں اللہ کی مدد شامل ہو جاتی ہے۔

آزمائش میں دعا کا کردار

جب الفاظ ختم ہو جائیں، دلیل ناکام ہو جائے اور دل تھک جائیں—تو دعا باقی رہتی ہے۔

ازدواجی آزمائش میں:

شوہر کی خاموش التجا

بیوی کی آنسوؤں بھری دعا

وہ دروازے کھول دیتی ہے جو نظر نہیں آتے۔

آزمائش کے بعد نیا آغاز

اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ:

ماضی کو سبق بنایا جائے

ہتھیار نہیں

زخم کو یاد رکھا جائے مگر کرید انہ جائے
یہی ازدواجی بلوغت ہے۔
آزمائش ازدواجی زندگی کا حصہ ہے
صبر تعلق کو ٹوٹنے سے بچاتا ہے
بحالی اسلام کا پسندیدہ راستہ ہے
معافی اور دعائیں شروعات کی کنجی ہیں

اختتامی باب

کامیاب ازدواجی زندگی

سکون، محبت اور قربِ الٰہی تک پہنچنے کا اسلامی راستہ

ازدواجی زندگی محض ایک سماجی بندھن نہیں بلکہ ایک مسلسل روحانی سفر ہے۔ یہ سفر دو جسموں کا نہیں بلکہ دو دلوں، دو ذہنوں اور دو نیتوں کا ہے۔ اسلام اس رشتے کو دنیا کی عارضی ضرورت کے بجائے آخرت کی تیاری کا ذریعہ بناتا ہے۔ قرآنِ مجید میں میاں بیوی کے رشتے کو جس انداز سے بیان کیا گیا ہے، وہ اسے عبادت کے درجے تک لے جاتا ہے۔ سکون، محبت اور رحمت — یہ تینوں الفاظ اس بات کا اعلان ہیں کہ کامیاب ازدواجی زندگی محض حالات کا نتیجہ نہیں بلکہ کردار کا ثمر ہے۔

سیرتِ نبوی ﷺ: کامل ازدواجی نمونہ

اگر ازدواجی زندگی کا کوئی کامل نقشہ ہے تو وہ رسولِ اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ ہے۔

آپ ﷺ:

شوہر بھی تھے

مربی بھی

قائد بھی

اور رحمت بھی

آپ ﷺ کی زندگی ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ:

محبت وقار کے خلاف نہیں

نرمی کمزوری نہیں

مشاورت اختیار چھننے کا نام نہیں

اور صبر شکست نہیں بلکہ فتح کی تمہید ہے

امہات المؤمنینؓ کے ساتھ آپ ﷺ کا رویہ اس بات کا اعلان تھا کہ اسلام میں عورت بوجھ نہیں بلکہ نعمت اور امانت ہے۔

ازدواجی کامیابی کے بنیادی ستون

اس کتاب کے تمام ابواب مل کر جن ستونوں کو واضح کرتے ہیں، وہ یہ ہیں:

ایمان اور نیت

جہاں نیت اللہ کے لیے ہو، وہاں رشتہ بوجھ نہیں بنتا۔

محبت اور رحمت

محبت الفاظ سے نہیں، رویوں سے ظاہر ہوتی ہے۔

عدل اور احترام

احترام کے بغیر کوئی رشتہ دیرپا نہیں ہوتا۔

مشاورت اور برداشت

اختلاف ختم نہیں ہوتے، سنبھالے جاتے ہیں۔

دعا، صبر اور شکر

یہی وہ روحانی قوتیں ہیں جو ناممکن کو ممکن بناتی ہیں۔

اولاد کی مشترکہ تربیت

نسلوں کی اصلاح، ازدواجی ہم آہنگی سے جڑی ہے۔

مرد اور عورت: مقابل نہیں، تکمیل

اسلام نے میاں بیوی کو ایک دوسرے کا حریف نہیں بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل بنایا ہے۔

شوہر:

محافظ ہے

ذمہ دار ہے

سمت دینے والا ہے

اور بیوی:

سکون کی امین ہے

محبت کی معلمہ ہے

دعا کی قوت ہے

جب یہ دونوں اپنے اپنے دائرے میں عدل کے ساتھ کھڑے ہوں، تو گھر ایک چھوٹی سی جنت بن جاتا ہے۔

ازدواجی زندگی اور آزمائش

یہ کتاب یہ دعویٰ نہیں کرتی کہ کامیاب ازدواجی زندگی میں مسائل نہیں ہوتے، بلکہ یہ سچ بتاتی ہے کہ:
کامیاب گھر وہ نہیں جن میں آزمائش نہیں آتی، بلکہ وہ ہیں جہاں آزمائش کے باوجود رشتہ نہیں ٹوٹتا۔
صبر، معافی، خود احتسابی اور اللہ کی طرف رجوع — یہی وہ اوزار ہیں جن سے ٹوٹتے رشتے جڑ جاتے ہیں۔

خاموش کرداروں کی عظمت

ازدواجی زندگی میں سب سے بڑا کردار اکثر:

نظر نہیں آتا

سراہا نہیں جاتا

مگر تاریخ بدل دیتا ہے

یہ کردار:

ایک بیوی کی خاموش دعا

ایک شوہر کی ضبط شدہ زبان

ایک ماں کی راتوں کی بیداری

ایک باپ کی بے آواز قربانی

پر مشتمل ہوتا ہے۔

ذاتی عکاسی: تحریر سے پہلے زندگی

یہ تحریر محض مطالعے کا نتیجہ نہیں بلکہ زندگی کے تجربے، صبر کے مراحل اور دعا کے ثمرات کا نچوڑ ہے۔

امہات المؤمنینؓ کی سیرت سے یہ سبق ملا کہ عشقِ خالص، وفاداری اور استقامت ہی وہ راز ہیں جو گھروں کو جنت نظیر بنا دیتے ہیں۔

آٹھ برس کے سفر کے بعد جب اللہ نے قلم اٹھانے کی توفیق دی تو یہ الفاظ نہیں، ایک امانت کاغذ پر اتری۔

آخری پیغام

اگر اس کتاب کا کوئی ایک پیغام ہے تو وہ یہ ہے:

ازدواجی کامیابی باہر سے نہیں، اندر سے شروع ہوتی ہے۔

اور اندر کی اصلاح اللہ سے جڑنے سے ہوتی ہے۔

جب میاں بیوی ایک دوسرے کو نہیں بلکہ اپنے رب کو راضی کرنے نکل پڑیں، تو اختلاف بھی عبادت بن جاتا ہے اور قربانی بھی سکون۔

اختتامی دعا

اے اللہ!

ہمیں ایسے گھر عطا فرما جہاں

محبت عبادت ہو

خاموشی دعا ہو

اور صبر کامیابی بن جائے۔

آمین۔

مصنف کی طرف سے چند آخری کلمات

یہ کتاب لکھتے وقت ایک بات بار بار دل میں آتی رہی کہ
ازدواجی زندگی کو سب سے زیادہ نقصان لاعلمی سے نہیں، بلکہ بے توجہی سے پہنچتا ہے۔
ہم اکثر:
نکاح تو کر لیتے ہیں
مگر اس رشتے کی روح کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے
ہم حقوق یاد رکھتے ہیں
مگر ذمہ داریاں بھول جاتے ہیں
یہ کتاب کسی ایک فریق کو درست اور دوسرے کو غلط ثابت کرنے کے لیے نہیں لکھی گئی۔
یہ کتاب آئینہ ہے،
جس میں ہر شخص خود کو دیکھ سکتا ہے۔

اگر آپ اس کتاب کے کسی صفحے پر:
خود کو پہچان لیں
اپنی کسی کمی کو محسوس کر لیں
یا کسی لمحے رک کر یہ سوچیں کہ
"مجھے بہتر شوہر / بہتر بیوی بننا چاہیے"
تو یہی اس کتاب کی کامیابی ہے۔
یہ تحریر امہات المؤمنینؓ کی سیرت، رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ، اور ایک عام مگر سچے ازدواجی سفر کے تجربے سے جنم لے کر کاغذ پر اتری ہے۔
—یہ نہ دعویٰ ہے، نہ فتویٰ
یہ دعوت ہے:
سکون کی طرف،
عدل کی طرف،
اور اللہ کی طرف۔

اختتامی دعا
اے اللہ!
جن گھروں میں یہ الفاظ پڑھے جائیں،
وہاں:

تلخی کو نرمی میں بدل دے
خاموشی کو دعا بنا دے
اور اختلاف کو رحمت کا ذریعہ بنا دے
اے ربِ کریم!
ہمیں ایک دوسرے کا نہیں،
اپنا محاسبہ کرنے والا بنا۔
آمین یارب العالمین۔

پکارِ ناگہانی اور آغازِ حکایت

فون کی مسلسل بجتی ہوئی گھنٹی جیسے ازل سے میرا پیچھا کر رہی تھی۔ فون مسلسل بج رہا تھا، لیکن گزشتہ تین ہفتوں کے غیر ملکی اسفار نے جسم و جان کو اس قدر تھکا دیا تھا کہ میں اس گھنٹی کو اپنی ذمہ داریوں کے بوجھ کی نئی دستک سمجھ کر اٹھانے سے جی چراتا رہا۔ دل میں ایک انجانا خوف تھا کہ کہیں کوئی نئی ذمہ داری سر پر سوار نہ ہو جائے۔ مگر پھر اللہ نے دل میں وہ قوت ڈالی جسے صوفیہ *واردِ الٰہی* کہتے ہیں۔ ایک ایسا لمحہ جو آتا ہے تو ہاتھ بے اختیار حرکت میں آجاتا ہے۔ نہ جانے کس قوتِ غیبی نے میرے ہاتھ کو حرکت دی کہ میں نے فون اٹھالیا۔

—فون اٹھایا تو دوسری طرف وہی مہربان آواز

حافظ طاہر —جو میرے لیے *محبتِ ربانی کا اشارہ* ہے۔

صوفیہ کہتے ہیں کہ خدا اپنے بندوں کی محبت کو "ربّ کی نشانیوں" میں رکھ دیتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ یہ آواز بھی انہی نشانیوں میں سے ہے۔

درِ آغاز—ایک صدا، جس نے دل کے دریچے کھول دیے

آواز—جو دروازہ بن گئی

—مگر پھر ایک لمحہ آیا—وہی لمحہ جسے رومی *ہنگامِ تجلّی* کہتے ہیں

اور میں نے فون اٹھالیا۔

محبت میں بھیگی ہوئی،

ایسی جیسے کسی صوفی زاویے کی اذان۔

صوفی کہتا ہے:

"جو محبت سے بلائے، وہ خدا کی طرف سے بلاتا ہے۔"

سو مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ دعوت زمین کی نہیں، آسمان کی ہے۔

حافظ طاہر صاحب، سیکرٹری صوبہ بلوچستان—دوسری طرف ہمیشہ کی طرح وہی مترنم، محبت ریز، اور خلوص—سامنے *میرا بیٹا نہیں، میرا دل کا ٹکڑا*

—خلوص و محبت سے بھری آواز تھی، اپنی مخصوص مترنم، مودّت بھری آواز کے ساتھ موجود تھا۔

آواز—جو دروازہ بن گئی—یہ آواز ہمیشہ مجھے ﴿وَخَفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ﴾ کی یاد دلاتی ہے

یہ آواز ہمیشہ میرے دل کے دریچوں پر دستک دیتی ہے اور آج بھی اسی شفقت سے استقبال کر رہی تھی۔

وعدہ—جو میرے اختیار میں نہ تھا

—*مختصر* سلام و دعا کے بعد انہوں نے اطلاع نہیں، *اعلانِ امر* سنایا

عالمی اقبال کانفرنس کوئٹہ میں سب سے پہلا مدعو آپ ہی کو کرنا تھا—اور ہم نے کر لیا ہے۔

حافظ صاحب نے مختصر سی تمہید کے بعد بڑی محبت سے "عالمی اقبال کانفرنس، کوئٹہ" میں شرکت کا وعدہ لے لیا۔ فرمائش بھی ایسی کہ جسے ٹالنا میرے بس کی بات نہیں تھی:

میں ان سے یہ کہہ بھی نہ سکا کہ سفر کی تھکن اور صحت کے مسائل مجھے کس کرب میں مبتلا کیے ہوئے ہیں اور میرے سامنے دیو ہیکل بنے کھڑے تھے مگر

دعوت ایسی تھی جس میں انکار کی گنجائش پیدا کرنا بھی جرم محسوس ہو رہا تھا۔

اقبالؒ کے نام کی محبت بھی کچھ کم حیلہ گر نہیں—وہ انسان کو اس کے عذر سے پکڑ لیتی ہے۔

آن لائن شرکت کا خیال—اور دل کا حجاب

فون بند ہوا تو دل نے کئی راستے تراشے۔ میں نے دیر تک سوچا کہ کیوں نہ آن لائن لیکچر کی راہ اختیار کر لی جائے؟ سہولت بھی پوری، اور میڈیا کا تجربہ بھی موجود۔

گھر سے عالمی کانفرنسوں میں شرکت اب مشکل نہیں رہی۔

مگر دل پر ایک عجیب سا پردہ تھا

جیسے روح کہہ رہی ہو کہ یہ سفر محض جسم کا نہیں، ارادے کا امتحان ہے۔

مگر دل نے کہا:

"اے مسافر! محفلِ عشق میں جسم کی حاضری بھی ادب ہے۔"

مگر نجانے کیوں دل پر ایک حجاب طاری ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کچھ فرائض ایسے ہیں جو قدموں سے ادا ہوتے ہیں، سکرینوں سے نہیں۔

وقت کا دروازہ، محبت کی دستک

کوئٹہ کا سفر

میرے لیے رستہ نہیں،

پیغام تھا۔

—فون بجتا رہا

میں نے ٹالا،

وقت نے نہ ٹالا۔

آواز آئی:

"سر، ایک خطاب کرنا ہے۔"

اور یوں لگا جیسے کسی نے

روح کے بند کواڑوں پر دستک دی ہو۔

کاشف شمس کہتا ہے:

سفر وہ نہیں جو قدم اٹھائے؛

"سفر وہ ہے جس میں دل کو ہجرت نصیب ہو۔"

مجھے اسی ہجرت پر بھیجا گیا تھا۔

دعوت—جو محض رابطہ نہیں، پیغام ہوتی ہے

اور میں نے دل ہی دل میں محسوس کیا

کہ اقبالؒ کے ذکر کی محفلیں

صرف تقریبات نہیں ہوتیں؛

وہ روح کے موسم ہوتی ہیں۔

یہ اعلان تھا، دعوت نہیں؛

اور ایسی دعوتیں آسمانی ہوتی ہیں، زمینی نہیں۔

خواہ تھکن ہو یا بیماری،

آدمی انکار نہیں کر پاتا۔

کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اسے **کسی بڑے کام کے لیے چنا گیا ہے**

مگر دل نے کہا:

"اے مسافر! محفلِ عشق میں جسم کی حاضری بھی ادب ہے۔"

"اقبالؒ کے نام پر سہولت نہیں، حاضری چاہیے۔"

دل کی تڑپ—جس نے سہولتوں کو بے معنی کر دیا

یوں سہولت شکست کھا گئی

اور محبت جیت گئی۔

—میں نے فیصلہ کر لیا

میں ضرور کوئٹہ جاؤں گا۔

بوجھل جسم اور تھکے ہوئے دل کے باوجود کوئٹہ ضرور جاؤں گا۔

کہ یہی دورِ جدید کا عرف ہے،

اور یہی مجبوریوں کی آسان راہ۔

اور صوفیہ کا قاعدہ ہے:

محبوب کی محفل میں جسم کا سفر بھی عبادت ہوتا ہے۔

یوں میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں سفر کروں گا—چاہے تھکاوٹ میرے قدموں کو خاموش ہی کیوں نہ کر دے۔

موضوع کا بارِ امانت اور مسئولیت کا احساس

اقبالؒ کا پیغام اور میرا اضطراب

میں کانفرنس کے دنوں کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ ملک بھر کے اقبال شناس، درد مند محققین اور عاشقانِ اقبال یہاں جمع ہونے والے تھے۔ دل میں ایک ہی سوال گونجتا تھا:

"اقبالؒ کے کس پہلو کو بیان کروں جسے اہلِ دانش پہلے ہی اپنے قلم سے نہ نواز چکے ہوں؟"

ہر گزرتا دن مجھے قریب آنے والی کانفرنس کا اور بھی شدت سے احساس دلانے لگا۔

سوچا:

اقبالؒ — جس مزارِ فکر کے دروازے کھولنے کے لیے ہزاروں محقق دن رات سرگرداں ہیں — میں ان کے کس پہلو پر گفتگو کروں؟

مجھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے میں خود کو عہدِ اقبالؒ کے سامنے جواب دہ پاتا ہوں۔

اقبالؒ، دراصل آئینۂ دل تھے —

میں سوچتا تھا

اقبالؒ کے کلام میں کس نغمے کو چُنوں؟

کس پیغام کو اٹھاؤں؟

مگر پھر احساس ہوا کہ

اقبالؒ کا ہر شعر

— انسان کو اس کی اپنی طرف بلاتا ہے

بالکل ویسے ہی

جیسے رومیؒ انسان کو

اس کے دل کی گہرائی میں لے جاتے ہیں۔

رومیؒ نے کہا:

— تو آبِ رواں ہے"

"اپنی موج کو پہچان"

اقبالؒ نے کہا:

— اپنی حقیقت کو تو بدل سکتا ہے"

"نصیبا تیرا بدل سکتا ہے

دونوں دراصل ایک ہی چراغ کے دو شعلے ہیں۔

اقبالؒ کا سوال—اور میرا ضعف

ہر گزرتے دن کے ساتھ فکر بڑھتی گئی:

اقبالؒ—جس کے ہر شعر میں جہان آباد ہے

—اقبالؒ—جس کے ہر مصرعے میں کائنات دھڑکتی ہے

میں ان کے کس پہلو کو سامنے رکھوں؟

مجھے یوں لگا جیسے میرا اپنا ضمیر مجھ سے پوچھ رہا ہو:

"کیا تم نے اقبالؒ کو صرف پڑھا ہے یا جیا بھی ہے؟"

اقبالؒ کا سوال—جو دراصل اپنا سوال تھا

میں سوچتا رہا: چلئے حاظ صاحب سے اس گتھی کو سلجھانے کے لئے درخواست کرتا ہوں۔

موضوع پوچھا تو حافظ صاحب نے صرف اتنا کہا:

"اقبالؒ آج کے نوجوان کو کیا کہہ سکتے ہیں؟"

"صرف یہ بتا دیجیے کہ اقبالؒ آج کے بلوچستان کے نوجوان سے کیا چاہتے؟"

میں ان کے کس پہلو کو بلوچستان کے نوجوانوں کے سامنے رکھوں؟

یہ سوال نہیں، کسوٹی تھا۔

تصوف کی اصطلاح میں یہ *امتحانِ سلوک* تھا۔

رومیؒ کہتے ہیں:

"جب سوال بڑا ہو، سمجھو جواب اندر موجود ہے، ابھی ظاہر ہونا باقی ہے۔"

—اور ہاں

تینوں دن کے لیکچر آپ ہی دیں گے۔

"دوسرے دن خواتین کے لیے خصوصی نشست بھی ہو گی۔

یوں گفتگو ختم ہوئی، اور ذمہ داری کے در وا ہو گئے۔

کوئٹہ—جہاں میں نے اپنے آپ کو پایا

کوئٹہ—روح کا ایک مقام

کوئٹہ—جہاں دل نے شکر ادا کیا

قلبی ترقّی نہیں—باطنی کشف

کوئٹہ پہنچتے ہی دل نے کہا:

﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ﴾ کا زمزمہ اٹھا۔

(اے انسانو! اپنے رب کی کون کون سی نعمت جھٹلاؤ گے؟)

—یہ صرف تلاوت نہیں تھی

یہ شکر کا سانس تھا۔

کوئٹہ کے ہوائی اڈے کے باہر

دیکھتے ہی سب سے پہلے حافظ صاحب تیزی کے ساتھ دوڑتے ہوئے بغلگیر ہو گئے،

ہاتھوں کو چومنا شروع کر دیا،

دگیر معزز احباب ہاتھوں میں پھولوں کے گلدستے لئے ہوئے،

پاکیزہ مسکراہٹ اور روشن چہروں کے ساتھ باری باری گلے ملنے لگے

یوں لگ رہا تھا جیسے روح پر برسوں کا آلام سچے جذبوں نے دھو ڈالا۔

تعمیرِ نو ٹرسٹ کے رفقاء اور نوجوان،

برادرم سجاد صاحب عمر بھر کا میڈیا کا ریاض تھامے ہوئے، بریگیڈیئر جلیل صاحب، برادرم نسیم صاحب، رانا صاحب، افضل صاحب، سیف اللہ صاحب،

بلال اسود جس کے چند اشعار نے دل لوٹ لیا، کس کس کا نام لوں؟

—مجھے مجہول انسان نہیں لگے

بلکہ دل کے وہ چراغ لگے

جن سے محبت اور خدمت کی خوشبو اٹھتی ہے۔

ان کے اخلاق نے مجھے بتا دیا

کہ سفر قیمتی تب ہوتا ہے

جب وہ منزل سے زیادہ *انسان* عطا کرے۔

تعمیرِ نو ٹرسٹ کی وہ محبت بھری میزبانی، انکساری، اخلاص اور خدمت گزاری کے آداب آج بھی دل میں چراغوں کی طرح روشن ہیں۔ ہر لمحہ ایسا کہ دل ان کے آدابِ میزبانی کا قیدی بن کر رہ جانے پر راضی ہو جائے اور ساری عمر رہائی کی تمنا نہ کرے۔۔

—یہ تین دن محض ایک کانفرنس نہ تھے

یہ میرے *اندر* کی شکستہ اینٹوں کو از سرِ نو جوڑنے کا عمل تھا۔

تعمیرِ نو ٹرسٹ کے افراد کے اخلاق، انکساری، مہمان نوازی،

—اور وہ محبت جو مجلسوں میں بکھر کر دل میں اترتی رہی

یہ سب میرے لیے کسی باغِ روحانی کی خوشبو بن گئے۔

یہاں پانچ دن گزار کر میں نے جانا کہ
—کچھ سفر منزلوں کے لیے نہیں ہوتے
اندر کے پردے اٹھانے کے لیے ہوتے ہیں۔
یہ دن ایسے گزرے کہ روح کی پیاس بجھتی چلی گئی۔

قلم کا معجزہ—جو برسوں نہیں ہوا تھا

پچاس برس سے میں لکھنے کے مرض میں مبتلا ہوں۔
ستر کتابیں منصہ شہود پر آچکی ہیں، پانچ مسودے آخری توجہ کے منتظر ہیں۔
مگر اپنی اہلیہ ثمینہ سمیع کے بارے میں میں ایک سطر تک نہ لکھ سکا۔
یہ وہ قرض تھا جو برسوں میرے دل میں ایک تہہ در تہہ بوجھ کی مانند پڑا رہا۔
قلم جیسے میرے ہاتھ میں آتے ہی بوجھل ہو جاتا تھا۔
— قلم ہاتھ میں آتا تو دل پر ایک پردہ پڑ جاتا
جیسے کوئی نادیدہ طاقت رک رہی ہو۔
یہ اس کانفرنس کا فیض تھا
کہ ڈاکٹر قندیل بدر کا مقالہ سنتے ہی دل کی پرتیں چیخ گئیں،
دل پر ایک نوری بجلی گری۔
اس مقالہ کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ بیٹی قندیل کا فون پر نام جگمگایا:
یقین آ گیا کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے،
ابھی بیٹی کو یاد کر رہا تھا کہ اس نے بھی عملاً یاد کر لیا:
کوئٹہ کی مہمان نوازی اور اخلاص کا ذکر ہو رہا تھا کہ اچانک اس نے ثمینہ کے بارے میں پوچھ لیا۔
نجانے اس کے دل میں کیا آئی کہ
اسی رات بیٹی نے تقریباً حکم کے لہجے میں کہا:
"لالہ! ماں جی کے بارے میں ضرور لکھیں۔"
میں نے اپنی مجبوری بیان کی، مگر اس نے پورے یقین سے کہا:
"اس بار آپ لکھنا شروع کریں گے تو کوئی رکاوٹ نہیں ہو گی۔"
اور اس جملے میں شاید خدا نے اپنا حکم رکھ دیا تھا۔

میری روح کے زخموں سے روشنی پھوٹنے لگی۔
اور پھر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ

وہ معجزہ جس نے *حدیث وصال* کو جنم دیا
وہیں، اسی لمحے، قلم نے وہ رکاوٹیں توڑ دیں جنہیں میں پتھر کی دیواریں سمجھ بیٹھا تھا۔
اور اسی لمحے، جیسے غیب سے ایک نسیمِ رحمت آئی
یوں *حدیث وصال* میری زندگی کا دبایا ہوا دریا تھا
جو پھوٹ پڑا۔

...اور پھر وہ گھڑی آئی—

مسافر جب مقامِ سِر تک پہنچتا ہے
—تو اس کے سامنے ایک پردہ اٹھتا ہے
بغیر ہوا کے،
بغیر ہاتھ کے،
بغیر سبب کے۔
—میں برسوں تک نہیں لکھ سکا
اور ایک لمحے میں لکھنے لگا۔
—یہ کرامتِ قلم نہیں تھی
یہ اذنِ محبت تھا۔
قندیل نے جو جملہ کہا:
"لالہ، آپ کو ماں جی پر لکھنا چاہیے"
—وہ محض نصیحت نہیں تھی
وہ فتحِ باب تھا۔
ابنِ عربی کہتے ہیں:
جب دل اجازت دے دے،
"تو قلم اللہ کے ہاتھ میں آ جاتا ہے۔
اور میں نے اسی ہاتھ کو لکھتے دیکھا۔
درجنوں صفحات
—یوں اترے جیسے آسمان سے بارش اترتی ہے
خاموش،
پاک،
بے ساختہ۔

اور بس.....

میں اٹھا، قلم اٹھایا، اور لکھنے لگا۔ جی ہاں!

لفظ یوں بہنے لگے جیسے برسوں سے قید کسی چشمے کو راستہ مل گیا ہو۔

اور میں نے کئی درجن صفحات ایک ہی نشست میں لکھ ڈالے۔

—اس کے فوراً بعد یہ خیال آیا

پھر یہ نعمتِ خداوندی یہ صفحات قندیل، روزینہ، ہارون، حافظ طاہر صاحب اور بہن نجیبہ عارف صاحبہ کو اصلاح کے لئے بھیجے۔

ابھی ایک گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ روزینہ اور ہارون کا مشترکہ اصرار آیا

انکل! یہ تو ابھی آغاز ہے۔"

—وہ یادداشتیں بھی لکھیں جو صرف ہم جانتے ہیں

اور جو قارئین کے لیے بہت نافع ہوں گی۔

اگلے دن بہن نجیبہ عارف نے اصلاح دینے کے بجائے حکم دیا:

"اصل سببِ تحریر بھی لکھیں"

اور یوں ہر طرف سے حکم، محبت اور دعا کے بے شمار دریچے کھلنے لگے کہ

مزید بھی لکھیں—کہ لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

یوں حدیثِ وصال کا متن بڑھتا گیا، اور میں اپنے ہی احساسات کے ہجوم میں بے بس سا بیٹھا رہا۔

یوں مسودہ بڑھتا گیا، صفحات قطار اندر قطار جمع ہوتے گئے۔

اور آخر کار میرے عزیز بیٹے حافظ طاہر نے وہ دلیل پیش کی:

"اللہ جانے کتنی بیٹیاں، بہنیں، خواتین ان تجربات سے رہنمائی پائیں گی۔"

گویا وہی میرے مربی ہیں جن کے اصرار سے کتاب کی ضخامت تین گنا ہو گئی۔

—یہ کرامتِ قلم نہیں تھی

یہ توفیقِ خداوندی تھی۔

یادداشتوں کا دریا—جو رکا ہوا تھا، بہہ نکلا

—حافظ طاہر، قندیل، روزینہ، ہارون، نجیبہ عارف صاحبہ

یہ سب میرے لیے اہلِ محبت کے قافلے ہیں۔

ان کی دعاؤں نے

اور ان کے اصرار نے مجھے وہ ہمت دی

جو برسوں تک میرے پاس نہیں تھی۔

رومیؒ کہتے ہیں:

"جب مخلص دل تجھے لکھنے کو کہے، سمجھ لے رب تجھے شفا دینے کو لکھوا رہا ہے۔"

اس کتاب میں تحریر ہونے والے جملے

—میرے ہاتھ کے نہیں

میرے رب کے ہیں۔

میری کیا مجال!

میں جو گزشتہ آٹھ سال اپنی اہلیہ، ثمینہ سمیع، کے بارے میں

ایک سطر تک نہ لکھ سکا۔

قلم اٹھاتا تو دل پر پردہ اتر آتا۔

ہاتھ کانپتے،

—خیال بکھر جاتا

جیسے کوئی اندر سے کہہ رہا ہو:

"یہ مقام ابھی تجھ پر نہیں کھولا گیا۔"

مگر کوئٹہ کی محفلیں،

اقبالؒ کی ساعتیں،

—اور ڈاکٹر قندیل بدر کا مقالہ اور محبت بھرا پرزور اصرار

سب نے مل کر وہ پردہ ہٹایا

جو برسوں سے میرے دل پر تھا۔

لیکن ایک بار پھر میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اب دل میں امڈتے ہوئے بیکراں طوفان پر بند باندھنے کی پوری کوشش کر رہا ہوں ایک مرتبہ پھر قلم اور دل کے ہاتھوں جاری جنگ میں محسوس کر رہا ہوں کہ مجھ میں مزید لکھنے کی تاب نہیں مگر یہ بھی سچ ہے کہ بہن جویریہ، بیٹی ڈاکٹر فرزانہ، سب کی دعاؤں نے میرے اندر وہ قوت پیدا کی کہ کم از کم اس محبت کے قرض کا ایک حصہ ادا ہو سکے—جو گزشتہ آٹھ برس سے میرے دل پر بوجھ بن کر بیٹھا تھا۔

عہدِ فراق کا صدقۂ سخن

یہ وہ اوراق ہیں جو آٹھ برسوں سے میرے سینے میں قید تھے۔ الحمد اللہ، بہن نجیبہ عارف، بیٹی قندیل، حافظ طاہر صاحب، روزینہ کی دعاؤں، ہارون کے مطالبے، اور بہن جویریہ و ڈاکٹر فرزانہ کی نرمیِ دل نے مجھے وہ قوت دی کہ میں نے اس فرض کی کچھ نہ کچھ ادائیگی کر دی۔

—میں جانتا ہوں

یہ کتاب میری کہانی نہیں، میرے رب کی عطا ہے۔

وہ رب جس نے فرمایا:

﴿وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾

(اور اپنے رب کی نعمت کا بیان کرتے رہو—سورۃ الضحیٰ)

حدیث وصال دراصل اسی حکم کی تعمیل ہے۔

یہ نعمتوں کا بیان بھی ہے، زخموں کا اعتراف بھی، اور ان محبتوں کا شکر بھی جو زندگی کے سنگلاخ راستوں پر میرے ساتھ چلتی رہیں۔

اس کتاب کا اصل مصنف کون ہے؟—

—میں گواہی دیتا ہوں

ان لفظوں میں میرا کچھ نہیں۔

یہ تحریر

—دل کی نہیں

دل کے اندر کے دل کی ہے۔

صوفیہ کہتے ہیں:

—دل ایک شہر ہے"

اور اس میں ایک اور دل پوشیدہ ہے؛

"اور اصل حقیقت اسی میں بولتی ہے۔

حدیث وصال

اسی باطنی دل کی گفتگو ہے۔

یہ کتاب

—غم کی نہیں

غم کے راز کی کتاب ہے۔

یہ کتاب عشق

عشق کی نہیں—

عشق کے اذن کی کتاب ہے۔

یہ کتاب

—سننے والوں کے لیے نہیں

جاگنے والوں کے لیے ہے۔

یہ کتاب—میرا نہیں، میرے رب کا کلام جو اس نے اپنے گناہ گار بندے سے لکھوایا:

یہ کتاب میری کہانی نہیں

میری عاجزی کی گواہی ہے
اور میرے رب کی نعمتوں کا بیان۔

حدیث وصال

اسی حکم کی تعمیل ہے۔
یہ زخموں کی نمی بھی ہے،
وصل کی روشنی بھی،
شکر کا گہرا آہنگ بھی،
اور صبر کی خاموش تسبیح بھی۔
—یہ میری نہیں
اس محبت کی داستان ہے جو اللہ نے میرے دل میں رکھی،
اور ان لوگوں کے دلوں میں رکھی جو میری زندگی کا حصہ رہے۔

یہ کتاب—وصال کا چراغ، فراق کا مصلّٰی

میں حدیث وصال کو
—اپنی زندگی کی کمائی نہیں سمجھتا
میں اسے
اللہ کے کرم کا عطیہ،
محبت کا ولایت نامہ،
اور صبر کا تسبیح دان سمجھتا ہوں۔
اور میں اسی حکم کی تعمیل میں
اپنی زندگی کے دیے ہوئے زخموں اور تحفوں کو
آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔

یہ کتاب "حدیث وصال"

دل کے اندھیروں میں جلتا ہوا چراغ ہے؛
روح کے صحرا میں بچھایا ہوا سجدہ گاہ ہے؛
اور فراق کی وادی میں اٹھنے والی دعا ہے۔

حدیث وصال میری زندگی کا شاید سب سے مشکل مگر سب سے سچا بیان ہے۔
یہ شخصی بھی ہے، روحانی بھی؛
تاریخی بھی، تہذیبی بھی؛
—اور سب سے بڑھ کر
محبت اور فقدان کی وہ داستاں ہے جو ہر قاری کے دل میں اپنا عکس ضرور چھوڑ جائے گی۔

فراق کی آگ، وصال کی خبر—۱

رومیؒ کہتے ہیں:
"آتشِ ہجر اگر اندر رکھو گے، جلا دے گی؛
باہر نکالو گے، چراغ بن جائے گی۔"
—میں نے بھی برسوں تک زخم کو چھپا کر رکھا
اور وہ زخم راتوں میں بولتا رہا،
خاموشی میں چیختا رہا،
وقت کے دروازوں پر دستک دیتا رہا۔

یہ کتاب **حدیث وصال**
—اسی زخم کی آواز ہے
ایک ایسی آواز
جسے میں نے نہیں لکھا،
جس نے مجھے لکھا ہے۔

ابنِ عربی فرماتے ہیں:
"ہر فراق میں ایک وصال چھپا ہوتا ہے؛
لیکن وہ صبر والوں پر ہی ظاہر ہوتا ہے۔"
میں نے اس راز کو عمر بھر پڑھا ضرور،
مگر قندیل کی آواز میں سنا۔

اختتام—دعا اور سپردگی

اختتام نہیں، ابتدا—

اے دوستِ دل!

اگر تو نے یہ کتاب دل سے پڑھی

تو تجھے اپنا فراق بھی

—وصال کا دروازہ لگے گا

اور اپنی تنہائی بھی

جلتا ہوا چراغ۔

اے ربِ عشق!

ان لفظوں کو

غم کرنے والوں کے لیے شفا بنادے،

اور تلاش کرنے والوں کے لیے راستہ۔

اللّٰهُمَّ اجْعَلِ الْفِرَاقَ لَنَا وِصَالًا،
وَالدُّمُوعَ نُورًا،
وَالْقُرْبَ سِرًّا،
وَالْحُبَّ حِجَابًا تَرْفَعُهُ عَمَّنْ تَشَاءُ.
آمِينَ

اے اللہ! ہماری جدائی کو بھی وصال بنادے،

ہماری آنکھوں کے آنسوؤں کو نور میں بدل دے،

قربت کو ایک راز بنادے جو دل ہی دل میں روشن رہے،

اور محبت کو ایسا پردہ بنادے

جسے تو جس سے چاہے اٹھادے

اور جس پر چاہے اپنے قرب کا جلوہ ظاہر فرمادے۔

آمین اللھم آمین یارب العالمین

سپردگی—اور اذنِ سفر

اے ربِ دل!

—تو جانتا ہے کہ یہ تحریر میری نہیں

تیری دی ہوئی ہے۔

اللّٰہم اجعل ہٰذہِ الکلماتِ نُورًا فِی القُلوب،
وَسَبَبًا لِلقُربِ إلیک،
وَرَحمۃً لِکُلِّ مَن قَرَأَہا،
وَشِفاءً لِکُلِّ مَن أحَسَّ بِألمِ الفِراق۔

اے اللہ! ان کلمات کو دلوں میں نور بنادے،

اور اپنی طرف قرب کا سبب بنادے،

اور ہر اس شخص کے لیے رحمت بنادے جو انہیں پڑھے،

اور ہر اس شخص کے لیے شفا بنادے جو جدائی کے درد کو محسوس کرے۔

اے اللہ!

ان لفظوں کو روشنی عطا کر، دوا کر، دعا کر،

اور دلوں کا سفر اپنے در تک پہنچادے۔

آمین یارب العالمین۔

اللہ سے دعا ہے کہ یہ تحریر

—کسی ایک دل کے لیے بھی روشنی کا چراغ بن جائے

تو یہی میری زندگی کی کمائی ہے

میں اس کتاب کو اپنے قارئین کے سپرد کرتے ہوئے دل سے یہ دعا کرتا ہوں کہ

اللہ اسے صرف میرے لیے نہیں،

ہر اس دل کے لیے مرہم بنائے جس نے فراق کے موسم دیکھے،

ہر اس روح کے لیے سند بنائے جو یادوں کی تپش میں سلگتی رہی،

اور ہر اس انسان کے لیے چراغ بنائے جو اپنے بوجھ کے ساتھ جینا سیکھ رہا ہے۔

میں اس کتاب کو اپنے قارئین کے سپرد کرتے ہوئے

یہی دعا کرتا ہوں:

اللّٰہم! اجعل ہٰذہِ الکلماتِ نوراً،
وشفاءً لِمَن قَرَأَہا،
وقُربۃً إلیکَ لِمَن کَتَبَہا۔

اے اللہ! ان کلمات کو نور بنا دے،
اور جس نے انہیں پڑھا اس کے لیے شفا بنا دے،
اور جس نے انہیں لکھا اس کے لیے اپنی جانب قرب کا ذریعہ بنا دے۔

اے اللہ!
اس کتاب کو میرے لیے بھی نافع کر دے،
اور ہر اس دل کے لیے باعثِ راحت بنا
جو فراق کے موسموں سے گزرا
اور وصل کی تمنا لیے جیتا رہا۔
آمین ثم آمین۔
اللّٰہم اجعلہ خالصاً لوجھک الکریم۔

مصنف —
سمیع اللہ ملک

حدیثِ پاکیزگی: عشقِ رسول ﷺ اور شبِ قدر کی رخصت کی شہادت

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ
اللَّهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلَىٰ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ، النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ، وَعَلَىٰ آلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ، وَسَلِّمْ تَسْلِيماً كَثِيراً۔

یا اللہ!

یہ کتاب تیرے نام سے شروع ہوتی ہے،

تیرے نور سے روشن ہوتی ہے،

اور تیرے اس فضل سے مکمل ہوتی ہے

جسے تو چاہے،

جب چاہے،

جسے چاہے عطا کر دیتا ہے۔

یہ صفحات اُس بندہ مؤمنہ کی یاد کے طور پر لکھے گئے

جس نے قرآن کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا،

عشقِ مصطفیٰ ﷺ کو اپنی دھڑکن،

اور حیا کو اپنا زیور۔

اے رب!

ان لفظوں میں جو سچائی ہے،

جو درد ہے،

جو محبت ہے،

—جو دُعا ہے

اسے قبول فرما۔

اس کتاب کو نور بنا،

اسے رہنمائی بنا،

اسے محبت اور صبر کی روشنی بنا،

اور اسے ثمینہ سمیع کی روح کیلئے

صدقۂ جاریہ فرما دے۔

یا اللہ!

ہر اس دل کو جو اسے پڑھے

ثباتِ ایمان، نورِ عمل

اور حسنِ اخلاق عطا فرما۔

آمین۔

اے ربّ الاعلیٰ!

یہ کتاب تیرے نام سے،

تیرے نور سے،

تیری ہدایت سے

اور تیرے محبوب ﷺ کی عطا سے

اپنی پہلی سانس لیتی ہے۔

یہ صفحات اُس روحِ پاکیزہ کی یاد میں ہیں

جس نے قرآن کو اپنا ساتھی،

نماز کو اپنا سہارا،

اور عشقِ رسول ﷺ کو اپنا زیور بنا لیا تھا۔

اے اللہ!

اس کتاب کے لفظ لفظ کو

نور بنا دے،

ذکر بنا دے،

دعا بنا دے۔

جو بھی اسے پڑھے

اس کے دل میں ایمان کی نرمی اتار،

اس کی آنکھوں میں خشوع کی چمک پیدا کر،

اور اس کے سینے میں محبتِ مصطفیٰ ﷺ کی روشنی بھر دے۔

یارب!

ثمینہ سمیع کی روح کو

ان لوگوں کے ساتھ ملا

جن کے لئے جنت نے راستے خود روشن کئے۔

یا اللہ!

یہ کتاب
تسلسلِ دعا ہو،
تسلسلِ رحمت ہو،
—تسلسلِ نور ہو

یا نور السموٰت و لارض!

اے وہ چاند جس کے سامنے ہر نور ماند پڑ جائے،
اے وہ مہک جس کے سامنے ہر خوشبو برکت طلبگار ہو جائے،
—اے وہ رحمت جس کے سامنے کائنات کے سب چراغ سجدہ ریز ہو جائیں
میں آپ کے اور اپنے آقا ﷺ کی بارگاہ میں ادب سے نظر جھکا کر یہ گزارش پیش کرتا ہوں۔

—ثمینہ سمیع

وہ خاتون جن کی نبض میں لا الٰہ الا اللہ کی حرارت
اور محبتِ محمد ﷺ کی ٹھنڈک ایک ساتھ دھڑکتی تھی۔
وہ جب قرآن کا صفحہ پلٹتی
تو آیتوں کی روشنی اس کے چہرے پر منعکس ہو جاتی،
جیسے کوئی شخص اللہ کے کلام کو نہیں پڑھ رہا
بلکہ اللہ کا نور اسے پڑھ رہا ہو۔
اس کے قرآن کے حاشیے
—آپ ﷺ کے عشق کی تفسیر ہیں
ہر حوالہ، ہر نوٹ، ہر ترجمانی
ایسے لگتے ہے جیسے اس نے لفظوں کے پار سے
آپ ﷺ کی سنت کو چھو لیا ہو۔
—یا رسول اللہ ﷺ
وہ آپ کی ازواجِ مطہرات کی حیاء کو
اپنی زندگی میں ڈھالتی تھی،
سیدہ فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کی چادرِ عصمت کو
اپنے عمل میں لاتی تھی،

اور آپ ﷺ کے اخلاقِ کریمانہ کی خوشبو
اپنے گھر میں پھیلا دیتی تھی۔

وہ ہر دعا میں عرض کرتی تھی:
یارسول اللہ ﷺ"
—میری تمنّا بس اتنی ہے
کہ قیامت کے دن
میں سیدہ فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا
کی صف میں کھڑی ہو جاؤں۔
یاحبیبِ خدا ﷺ!
ثمینہ اس آرزو کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوئی،
اس کی روح کو وہ مقام عطا کیجئے
جہاں امہات المؤمنین،
اصحابِ حسن و حسین،
اور خاندانِ نبوت کا سایہ ہو۔
یارسول اللہ ﷺ.....
اگر اس کی زندگی میں کوئی کمی رہ گئی ہو جو یقیناً بشری تقاضوں کی بناء پر ہو گی!
تو اسے آپ اپنی شفاعت کی چادر میں چھپا لیجئے۔

یا حیُّ یا قیّوم!
اے وہ رب جس کے اسمِ اعظم سے زندگی جاری ہے،
— اور جس کی رحمت کے بغیر ایک سانس بھی مکمل نہیں ہو سکتی
—اور جس کی رحمت کے بغیر ایک سانس بھی مکمل نہیں ہو سکتی
یہ کتاب تیرے ہی نور کے سامنے عاجز کھڑی ہے۔
یہ وہ صفحات ہیں
جہاں آنسو دعا بنے،
دعا لفظ بنی،
اور لفظ نور بن گئے۔
یہ وہ تذکرہ ہے
—جس میں ایک بندیِ مومنہ —ثمینہ سمیع

نے اپنی پوری زندگی
تیری اطاعت،
تیرے حبیب ﷺ کی محبت،
اور قرآن کے ادب کے ساتھ گزاری۔

یا اللہ!
جو بھی یہ کتاب کھولے
اس کے دل میں ایمان کے دروازے کھول دے،
اس کی آنکھوں میں خشیت کی نمی اتار دے،
اس کے سینے میں عشقِ مصطفیٰ ﷺ کی حرارت رکھ دے،
اس کی زبان کو ذکر کی مٹھاس عطا کر
اور اس کے قدموں کو استقامت بخش دے۔

یاربّ!
اس کتاب کے ہر لفظ کو
صدقات، دعاؤں، آنسوؤں، اور محبتوں میں شامل فرمادے۔

یااللہ!
اگر اس کتاب کی کسی سطر میں
—اخلاص ہے
تو اسے قبول کر۔
—اگر درد ہے
تو اس درد کو شفا بنادے۔
—اگر یاد ہے
تو اسے رحمت بنادے۔
—اگر محبت ہے
تو اسے رضا بنادے۔

یاربّ العرش العظیم!
یہ کتاب

ثمینہ سمیع کی روح کیلئے

چراغِ مغفرت بن جائے،

اور لکھنے والے کیلئے

نورِ ہدایت کا دریا۔

آمین یارب العالمین

یارحم الراحمین

یااکرم الاکرمین۔

اور لکھنے والے کیلئے، پڑھنے والوں کے لئے اور ان پر خلوص قلوب کیلئے جنہوں نے مجھے یہ یادداشتیں لکھنے کا حوصلہ دیا۔

ان تمام پاکیزہ نفوس کے لئے صدقۂ جاریہ کا دریا ثابت ہو۔

آمین یانورُ یارحیمُ یااللہ۔

محبت سے بھیگی ہوئی تحریر

یہ میری روح کی گہرائیوں تک اُتر جانے والی سب سے نازک، مقدس اور محبت سے بھیگی ہوئی تحریر ہے—اور میں بے حد **احترام، محبت اور جذبے** کے ساتھ وہ یاداشتیں قلمبند کروں گا جس میں ثمینہ سمیع کی پاکیزہ زندگی، قرآن سے اُن کی بے مثال محبت، اُن کے اوصافِ حسنہ، اور آپ کے دل کے وہ گھاؤ جو آٹھ برس تک قلم روک دیتے رہے... سب ایک جا، ایک ہی روشنی میں، ایک ہی سچائی میں سمٹ آئیں۔ یقیناً یہ تحریر ایسے لکھی گئی ہے جیسے میرے لرزتے ہاتھوں کے نیچے دبے ہوئے سارے آنسو، ساری یادیں، سارے دھڑکتے لمحے خود الفاظ میں تبدیل ہوتے گئے ہوں۔ اور ایسے الفاظ جس سے میرا دل بھیگ گیا ہے اور میری روح تک روشن ہو گئی ہے۔

محبت کبھی لفظوں میں پوری نہیں اترتی، اور کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں جنہیں تحریر میں قید کرنا دل پر قرض بن جاتا ہے۔

—یہ عورت جس نے اپنی زندگی عبادت میں گزاری

اس کا تذکرہ کرنے کیلئے دل کا کیا مقام ہونا چاہئے؟

اور اسی کشمکش میں ہر کوشش ادھوری رہ جاتی۔

—گویا میں نہیں لکھ رہا تھا

میرے زخم لکھ رہے تھے.....

اور سچی پرخلوص محبت کی یادوں کے زخم کبھی مکمل اور مندمل نہیں ہوتے۔

—مگر پھر شاید آسمان سے کوئی اجازت نازل ہوئی

شاید ثمینہ کی روح نے کوئی دعا کی،

—شاید خدا نے وہ روزن کھول دیا جہاں سے روشنی آتی ہے

اور میں پہلی بار آج اپنے دل کی دیواریں چیر کر لکھنے بیٹھا ہوں۔

اسی مشرقی حیا کے ساتھ جس نے ہمیں سکھایا کہ

میاں بیوی ایک دوسرے کے حسنِ عمل کو دل میں رکھتے ہیں،

زبان پر کم لاتے ہیں،

اور قلم پر تو کبھی نہیں.....

—مگر آج میں یہ تامل توڑ رہا ہوں

کیونکہ سچ کا حق ہے کہ اُسے لکھا جائے۔

اور ثمینہ کی پاکیزگی، اس کا صبر، اس کی خاموش نیکی،

اس کی عبادت، اس کا احترام، اس کی خدمت،

—اور اس کی محبت

یہ سب حق رکھتے ہیں کہ انہیں زمانے تک پہنچایا جائے۔

—اور اس بار مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نہیں لکھ رہا
بلکہ وہ لکھوا رہی ہے۔
اس کے قرآن کے ورقوں سے اٹھتی ہوئی روشنی،
اس کی دعا کی خوشبو،
—اس کی سجدوں کی نمی
سب میرے قلم میں اترتے چلے گئے۔
لگتا ہے جیسے یہ مضمون میرا نہیں.....
رب کا عطا کردہ ہے۔
میری ہمت نہیں.....
ثمینہ کی دعا ہے۔
میری تحریر نہیں.....
اس کی پاکیزہ زندگی کا صدقہ ہے۔
جب کاتب کا دل کانپ جائے اور رب اس کے قلم کو سہارا دے.....
—بعض دکھ ایسے ہوتے ہیں جنہیں وقت نہیں بھلاتا
صرف انسان کو خاموش کر دیتا ہے۔
اور میں بھی آٹھ برس تک اسی خاموشی کا قیدی رہا۔
آٹھ برس.....
آٹھ برس کے رک رک کر بہتے آنسوؤں کے بعد.....
جی ہاں! آٹھ طویل برس.....
آٹھ برس جن میں میں نے کئی مرتبہ قلم اٹھایا.....
آٹھ لمبے برسوں تک میں نے کئی بار کاغذ سامنے رکھا، قلم ہاتھ میں لیا، اور پھر بس خاموشی کے کسی گہرے سمندر میں ڈوب جاتا۔
ہر بار ہاتھ کانپ جاتے، دل دھڑکنے لگتا، یادوں کی ایک ایسی لہر اُٹھتی جو مجھے بالکل بے بس کر دیتی۔ قلم جیسے پتھر ہو جاتا، لفظ جیسے منہ موڑ لیتے، اور دل یادوں کے ایک ایسے ہجوم میں گھر جاتا کہ سانس لینا مشکل ہو جاتا۔
تحریر لکھنے کی نیت باندھتا تو ثمینہ کی ہر ادا، ہر مسکراہٹ، ہر نیکی، ہر قرآن کی آیت پر جھکتے ہوئے اس کا سراپا میری آنکھوں میں ایسا اُبھر آتا کہ لفظ بکھر جاتے۔
کبھی انگلیاں لرزتیں، کبھی آنکھوں کے آگے دھند آجاتی، کبھی دل، ضبط کے تمام بندھن توڑ دے اور میں ایک بار پھر قلم رکھ دیتا۔
میں نے خود کو سمجھایا کہ شائد وقت زخموں کو تھوڑا ہلکا کر دے۔
لیکن کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں جن کا خلا وقت نہیں بھرتا، خدا بھرتا ہے۔

ثمینہ کی یادیں.....

وہ یادیں جو صرف یادیں نہیں تھیں،

وہ تو زندگی کی دھڑکن تھیں،

وہ ایسے مقدس جگنو تھے جو ٹمٹماتے، اور پھر مجھے اندر سے توڑ دیتے۔

میں جب بھی لکھنے بیٹھتا،

—میری آنکھوں میں اُس کی وہی محبت اُتر آتی

جو نماز کے بعد اس کے ہاتھوں کی پشت پر چمکتی تھی.....

جو قرآن کے صفحوں سے جھلکتی تھی.....

جو میرے لئے اُس کی خاموش دعاؤں میں بسی رہتی تھی۔

میں لکھنے کی کوشش کرتا

تو دل کہتا:

یہ محبت کاغذ کے سیاہ حروف میں کیسے سمائے گی؟

یہ پاکیزگی لفظوں میں کیسے ڈھلے گی؟.....

اور جب اس بار میں نے پھر قلم اٹھایا تو لگا کہ شاید رب نے خود میرے دل کے کمرے میں روشنی بھر دی ہے... شاید ثمینہ کی دعاؤں نے... یا شاید وہ اخلاص جس کے ساتھ وہ پوری زندگی قرآن کو پڑھتی رہی، سمجھتی رہی، جیتی رہی—اُسی قرآن کے نور نے میرے راستے کے بند الفاظ کو دوبارہ کھول دیا۔

آج کی یہ تحریر، یہ پورا مضمون، یہ پوری محبت، اللہ کی مدد سے میری زندگی کی پہلی تحریر ہے جو میں نے اپنی مشرقی حیا کی ساری جھجک پر قابو پا کر، پوری سچائی کے ساتھ لکھ دی ہے۔ ہم مشرق والے اپنے گھروں کی عورتوں کی پاکیزگی، وفاداری، سچائی، عبادت اور کردار کو **دل میں سجاتے ہیں، کاغذ پر لکھتے ہوئے جھجکتے ہیں۔**

لیکن سچ کا حق تھا کہ لکھا جائے۔

—اور میں نے پہلی بار ہمت کی

کیونکہ ثمینہ کی زندگی صرف میری نہیں، یہ ایک **مثال** ہے، ایک **دین کی خوشبو** ہے، ایک **ایسی عورت کا عکس** ہے جو آج کی خواتین کیلئے مشعلِ راہ بن سکتی ہے۔

ثمینہ سمیع... وہ شریکِ حیات، وہ رفیقِ روح، وہ عبادت گزار ہستی،

جس نے میرے ساتھ گزرے ہوئے ہر لمحے کو

—ایمان، حیاء، صبر، خدمت، محبت اور وفاداری سے روشن کیے رکھا

اس پر قلم اٹھانا شاید میری زندگی کا سب سے مشکل امتحان تھا۔

اس کے رخصت کے بعد آٹھ سال تک میں لکھنے کی کوشش کی،

لیکن ہر مرتبہ قلم ہاتھ میں لیتے ہی
یادوں کی ٹوٹتی جھاڑیاں دل کے آس پاس یوں بکھر جاتیں
جیسے کوئی تازہ زخم دوبارہ رسنے لگے۔
میرا ہاتھ کانپ جاتا، انگلیاں لرز جاتیں،
—اور الفاظ، جنہیں کبھی میرا دل حکمت کی بارش سمجھ کر لکھتا تھا
وہ سب غائب ہو جاتے۔
یادِ ثمینہ نے مجھے آٹھ برس تک ایک ایسی خاموشی کا اسیر بنا دیا
جس میں صرف دل کی دھڑکن اور تکیے کی نمی گواہ تھی
مشرقی تہذیب میں میاں بیوی کا رشتہ عجیب تقدیس رکھتا ہے۔
—ایک دوسرے کے سامنے محبت عمل سے ثابت کی جاتی ہے
خدمت سے، بھروسے سے، دعا سے،
لیکن جب لکھنے کی باری آتی ہے
...تو ایک جھجک حائل ہو جاتی ہے
ایک حیا جو ہمارے گھروں کی بنیادوں میں بستی ہے۔
میں بھی اس جھجک میں بندھا رہا۔
ثمینہ کے وہ اوصاف، وہ قربانیاں،
—وہ عبادتیں، وہ صبر، وہ مسکراہٹیں
یہ سب دل میں تو گونجتے تھے،
مگر قلم پر کبھی نہیں آئے۔
لیکن آج.....
اللہ نے توفیق دی، دل نے ہمت کی،
اور آپ کی رفاقت نے سہارا دیا،
تو میں نے پہلی مرتبہ اپنے دل کی یہ شمع
— تحریر کے سامنے بے نقاب کر دی
وہ سچ، جو برسوں دل میں امانت بن کر موجود رہا۔
میں چاہتا ہوں کہ ثمینہ کی یہ داستان
صرف میرے دل کا بوجھ نہ بنے،
بلکہ ہر اُس گھر، ہر اُس دل تک پہنچے

جہاں عورت کی نرمی، زبان کی مٹھاس،
وفاداری، صبر اور دیانت
ازدواجی زندگی کو جنت بنا سکتی ہے۔
اگر یہ تحریر
کسی ایک بیٹی، ایک بیوی، ایک بہن،
یا کسی گھر کے رشتوں کے اندر
—نرمی، شکر، محبت اور وفا کا نور پیدا کر دے
تو سمجھئے ثمینہ کی پاکیزہ زندگی
آج بھی روشنی بانٹ رہی ہے۔

وہ صابر بھی تھی، شاکر بھی۔
وہ زبان میں ایسی شیریں تھی کہ مشکلیں خود آسان ہو جاتیں۔
وہ گھر کے ہر معاملے میں میری بہترین رفیق، معاون، سہارا، رازدار، اور دعا گو تھی۔
اور وہ قرآن سے ایسی بے لوث محبت رکھتی تھی کہ اُس کا ہر کاغذ، ہر حاشیہ، ہر لائن اس کے تعلیمی سفر کی گواہی بن چکا تھا۔
—اس تحریر کا آغاز میرے لئے عبادت ہے
اور انجام ثواب کی خواہش۔

جب میں نے ثمینہ کی وفات کے بعد اُس کا ذاتی قرآن کھولا.....
تو ہر صفحے کے کنارے پر اُس کے ہاتھ سے لکھے ہوئے تفاسیر کے حوالہ جات دیکھ کر میں بے اختیار لرز گیا۔
—وہ قرآن کو صرف پڑھتی نہیں تھی
سمجھتی تھی، ٹٹولتی تھی، سوال کرتی تھی، جواب ڈھونڈتی تھی، اور ہر سطر میں خدا سے اپنا رشتہ مضبوط کرتی جاتی تھی۔
اُس کے حاشیوں میں اس کے اپنے ہاتھوں سے لکھی ہوئی ان تحریروں نے بتایا کہ
وہ قرآن فہمی کی اُس منزل تک جا پہنچی تھی جہاں دل کا نور، علم پر سبقت لے جاتا ہے۔
اور پھر مجھے اس کی خواہش یاد آئی—
جب وہ کہا کرتی تھی:—
..... جنت میں اگر مجھے کوئی مقام ملے تو میری خواہش ہے کہ وہاں میں سیدنا فاطمتہ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی کنیز بن جاؤں
شاید اس لئے بھی کہ ثمینہ خود بھی ایک آباؤ اجداد والے **سید گھرانے** کی بیٹی تھی، اور سیدنا فاطمہؓ کو ہمیشہ میری ماں کہہ کر یاد کرتی تھی۔
لیکن یہ سب تو اُس سفر کا انجام تھا۔
اصل سفر تو دنیا میں اس کے قرآن کے ساتھ گزرا ہوا وقت تھا۔

—میں آج بھی اس کے قرآن کے حاشیے دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں
کتنے تراجم، کتنی تفاسیر،
..... کتنی علمی آراء، کتنی دعائیں
ہر لفظ، ہر آیت کے پہلو میں اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا نوراب بھی جگمگاتا ہے۔
—وہ قرآن پڑھتی نہیں تھی
قرآن اس کے اندر اترتا تھا۔
—وہ آفاقی معانی کو صرف سمجھتی نہیں تھی
عمل میں ڈھال دیتی تھی۔
—وہ دین کو گھر کی چار دیواری میں نہیں رکھتی تھی
اپنے سانس سانس میں سجا لیتی تھی۔
—دنیا میں اس کا ہاتھ سخاوت سے بھرا رہتا تھا
چاہے پاکستان ہو یا برطانیہ۔
اس کی سخاوت اتنی بے لوث تھی کہ
اگر جیب میں آخری نوٹ بھی ہوتا تو
کسی ضرورت مند کے ہاتھ میں رکھ دیتی۔

—لفافوں میں ریزگاری، نوٹ، صدقہ، خیرات کے لفافے مجھے دیکر تاکید کرتی:
—بس ہاتھ ڈال کر جو ملے، فوراً دے دینا...بغیر دیکھے، دے دینا، سوچنا نہیں۔
یہ میرا اللہ کے نام پر دیا ہوا ہے
—دینے والے کا ہاتھ دیکھنے سے نہیں
نیت سے بھرتا ہے۔

واقعے کا محرّک ـــ یاد کو جگانے والی گفتگو

اے اہلِ دل و نظر!

بات یہاں ختم نہ ہوئی ـــ اس واقعہ کے صفحات اسی طرح دل کے اندر محفوظ تھے، جیسے کسی صندوق میں رکھے ہوئے قیمتی موتی؛ نہ بیان کی آرزو، نہ شہرت کا داعیہ ـــ بس اپنے رب کے راز اور اپنے دل کے زخم۔

پھر ایک دن یوں ہوا کہ ایک نہایت محترم اور عزیز بزرگ، میرے مہربان بھائی **جناب بریگیڈیئر عبدالجلیل صاحب** کے ساتھ محفل سجی۔ گفتگو کا رخ دنیاوی معاملات سے ہوتا ہوا **رب کی شانِ کریمی، اس کے لطف و کرم، اور روحانی وارداتوں** کی طرف مڑ گیا۔ قلوب کی کیفیت میں نرمی آئی، آنکھوں میں روشنی اتری، اور زبان پر شکر کے ترانے۔

اسی اثنا میں اچانک دل کے دریچے کھلے اور یہ ترکی کا وہ حادثہ ـــ وہ دن، وہ پہاڑ، وہ سجدہ ـــ سب کچھ یوں تازہ ہو گیا جیسے ابھی ابھی گزر کر آیا ہوں۔ محفل پر سکوت طاری ہو گیا، اور میں دل ہی دل میں کہنے لگا:

اے پروردگار! تیری حفاظت کے قصے ختم کہاں ہوتے ہیں،

ہم بیان سے تھک جاتے ہیں، تو کرم سے نہیں تھکتا۔

اسی نشست میں میرا لختِ جگر، میرا بیٹا **ہارون** بھی خاموش سامع بن کر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت بھی تھی، محبت بھی، اور یقین کی چمک بھی۔ واپسی پر اس نے مسکرا کر کہا:

ـــ بابا جی! یہ واقعہ **حدیثِ وصال** میں ضرور شامل کریں"

لوگ جانیں کہ اللہ کیسے بچاتا ہے، کیسے تھام لیتا ہے۔

ـــ میں نے معمول کے انداز میں بات ٹالنے کی کوشش کی

کہ کتاب مکمل ہو چکی ہے

اب کچھ شامل کرنا مناسب نہیں

گویا خود کو بھی اور اسے بھی تسلی دیتا رہا۔

مگر ہارون ـــ اس کے اصرار میں ممتا کی نزاکت اور عقیدت کی گرمی اور حد درجہ احترام کے ساتھ فرمانبردار بچے کی ضد شامل تھی۔

وہ باز نہ آیا۔

ـــ دن گزرتے گئے

اور اس کے الفاظ میرے ارد گرد یوں گردش کرنے لگے جیسے کوئی دعا بار بار عرش تک پہنچنے کو بے تاب ہو۔

آخر کار کل پھر اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا:

بابا جی! بس ایک عرض ہے ـــ لکھ تو دیجیے،"

"مگر بہت زیادہ جذباتی نہ ہو جایا کیجئے... بس اسی کا ڈر ہے!

میں مسکرا دیا۔

دل نے کہا—یہ دریا کو کہنے کے مترادف ہے کہ بہاؤ قائم رکھو تو سہی مگر **لہریں نہ اٹھیں**۔

میں نے جواب دیا:

—بیٹے! تم عجیب فرمائش کرتے ہو"

کہ سمندر میں غوطہ بھی لگاؤں

اور جسم ولباس بھیگنے نہ پائیں؟

ایسی یادوں میں قلم کیسے سنبھلتا ہے؟

"دل جب بول اٹھے تو آنکھوں کو خاموش رکھنا ممکن کہاں رہتا ہے!

پھر توقف کے بعد عرض کیا:

زندگی کا نام ہی تو

مر مر کے جیئے جانے

اور جیتے جی اللہ کے حضور جھک جانے کا ہے۔

—یوں سمجھ لیجیے

یہ واقعہ قلم نے نہیں لکھا

دل نے لکھوایا ہے

اور دل کو لکھوانے والا—وہی ہے جس کے ہاتھ میں سب دل ہیں۔

حدیثِ وصال کے حاشیے پر—ایک محیر العقول واقعہ

یادوں کے اوراق میں ایک نیا اضافہ

حدیثِ وصال کے آسمان پر—ایک روح پرور کرامت کی جھلک

آج ہم ایک ایسے واقعے کا ذکر کرنے جا رہے ہیں جو محض واقعات کی تکرار نہیں، ایمان کی حرارت کا چراغ ہے؛ جو عقل کو حیرت اور دل کو یقین عطا کرتا ہے؛ جو بتاتا ہے کہ رب جب محافظ بن جائے تو گرتے قدموں کو بھی تھام لیتا ہے، اور جب کرم کی نظر ہو تو کھائیوں کے دہانے بھی پر سکون سبزہ زار بن جاتے ہیں۔

یہ قصہ نہیں—دل کی دھڑکنوں پر ثبت وہ لمحہ ہے جب انسان خود کو نہیں، اپنے رب کو دیکھ لیتا ہے؛ جب عقل حیرت سے رُک جاتی ہے اور یقین آگے بڑھ کر دستِ کرم سے دامن بھر لیتا ہے۔

اے اہلِ نظر! حدیثِ وصال کی تکمیل کے بعد روح کے نہاں خانوں سے کوئی صدا آنے لگی کہ اس گلستانِ یاد میں ایک ایسا واقعہ بھی ثبت کر دیا جائے جو محض داستان نہ ہو، بلکہ ایمان کے چراغ کو فروزاں کر دے، اس تحریر میں ایک ایسا باب بھی ہونا چاہیے جو نصیحت کو جلا دے، آنکھوں کو نمی دے، اور روح کو جھنجھوڑ دے۔ ایسا باب جو یہ اعلان کرے کہ

زندگی تمہاری تدبیر سے نہیں، اس کی تقدیر سے چلتی ہے:

جو محض آنکھوں کو نم نہ کرے بلکہ دل کے آئینے پر یقین کا نقش بھی جما دے۔ ایسا نقش جو وقت کی گرد سے نہ مٹے، اور ہر پڑھنے والا محسوس کرے کہ یہ میرے ساتھ بھی ہو سکتا تھا، اور جو بچا ہے... وہ محض میرا کمال نہیں—اس کا کرم ہے

اور حفاظت تمہارے احتیاط سے نہیں، اس کے کرم سے ملتی ہے۔

قاری کو چونکا دے اور پھر سوچ کی گہری وادیوں میں اتار دے۔ یہ واقعہ محض اتفاق نہیں، کرمِ ربانی کا ایسا جلوہ ہے جس میں نصیحت بھی ہے، عبرت بھی، اور رحمتِ الٰہی کی جھلک بھی۔

سِیرُوا فِی الْاَرْضِ—آیت کی صدا اور دل کی آمادگی، آیت سے عمل تک کا سفر

سیر و فی الارض—آیت کی ندا اور دل کی بیداری

جدہ سعودی عرب سے مکہ مکرمہ جاتے ہوئے جب پہاڑی سینوں پر لوحِ تقدیر کی طرح کندہ الفاظ **سِیرُوا فِی الْاَرْضِ** پہاڑوں کے سینے پر آیۂ کریمہ کے روشن حروف جھلملاتے ہیں، پہاڑی دامنوں پر جلی حروف میں تحریر سیر وافی الارض نگاہوں سے ٹکراتی ہے تو گویا آسمانِ ہدایت سے ندائے ربانی سنائی دیتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے پوری کائنات ایک ہی آواز میں کہہ رہی ہو،

اور یوں لگتا ہے گویا آسمانوں سے بلاوا ہے

—زمین میں چلو، پھرو، دیکھو

ماضی کے قافلوں سے سبق لو

اور یقین کے قدموں کو مضبوط کرو۔

"زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ تم سے پہلے گزر جانے والوں کا انجام کیا ہوا"

"سیر وافی الارض"

اسی آیت کی تازگی نے دل میں عزم کی شمع روشن کی، اسی ندا نے روح کو جھنجھوڑا، قدموں کو حرکت دی، اور 2002 میں ہم ایران کی بازرگان سرحد عبور کر کے ترکی کے سرسبز پہاڑوں اور سنگلاخ درّوں کی طرف روانہ ہوئے۔ ترکی کے پہاڑ، وادیاں، بادلوں میں لپٹی سڑکیں—اور انقرہ سے استنبول تک کا سفر، **بولو کے عظیم درّے** کے راستے۔ پہاڑی درّے سے گزرتا ہوا یہ راستہ—جہاں گھنگھور گھٹائیں، خمیدہ راستے اور سرنگوں کی طویل سانسیں مسافر کے ساتھ ہم قدم ہوتی ہیں۔

مسافر خانوں کی اذان اور پہاڑوں کی خاموشی

پہاڑ خاموش ہوتے ہیں—مگر بولتے ہیں

وہ درّہ بولو... پہاڑ جیسے سربستہ رازوں کے امین ہوں۔

کہیں ابر کا آنچل، کہیں دھوپ کی مسکراہٹ، کہیں وادیوں سے اٹھتی ہوا کی خاموش تسبیح۔

دل پر یہ کیفیت طاری تھی کہ:

سفر ہم کر رہے ہیں

مگر لے کوئی اور رہا ہے

راستے میں مسافر خانے، سادہ سے کمرے، دیواروں سے ٹکی اذان کی گونج، اور چھوٹی مسجدوں کے محراب، جو تھکے مسافر کے لیے آغوشِ رحمت بن جاتے ہیں۔ راستے کے یہ چھوٹے چھوٹے ہوٹل، گرم چائے کے کپ، اور مسافروں کے لیے سادہ مگر پرنور مساجد۔ ہم نے بھی نماز ادا کی، رزقِ حلال سے شکم سیر کیا۔

دل سے دل کی بات—زبان کی ضرورت نہیں پڑتی

اور پھر رختِ سفر باندھنے لگے۔ یہیں میں نے دیکھا کہ میری رفیقِ سفر، ثمینہ، ترک دیہاتی خواتین کے حلقے میں بیٹھی ہے اور ترک دیہاتی خواتین کے ساتھ محوِ گفتگو ہے—نہ زبان مشترک، نہ رسم الخط مانوس—مگر دل جب بول پڑے تو ترجمے کی ضرورت نہیں رہتی۔ فوری خیال آیا کہ

ثمینہ۔

نہ وہ ترک زبان جانتی تھی

نہ وہ انگریزی سے آشنا تھیں

مگر ہونٹوں پر مسکراہٹیں تھیں، آنکھوں میں نمی کی چمک، ہاتھ محبت کی زبان بول رہے تھے۔

سخاوت کے سائے میں ایک قلندرانہ جواب

میری حیرت اس وقت اور بڑھ گئی جب دیکھا کہ وہ **بڑے نوٹ ان کے ہاتھوں میں رکھ رہی ہے**۔ حیرت بھی ہوئی، محبت بھی۔ جب سوال کیا کہ چھوٹے نوٹ بھی تھے، پھر یہ فیاضی کیوں؟ تو مسکرا کر بولی:

سفر قبولیت کا موسم ہے، سفر میں دعا قبول ہوتی ہے۔ اگر ان مسکین عورتوں کی دعاؤں کے صدقے کچھ نوٹوں کے عوض آپ کی رفاقت میں جنت نصیب ہو جائے تو یہ سودا خسارے کا نہیں، نفع کا ہے۔

یہ جواب نہیں، ایک روحانی اعلان تھا—جیسے کسی درویش کی زبان سے صدیوں پرانا پیغام پھر زندہ ہو اٹھا ہو۔

یہ جواب نہیں تھا—دل کا مکاشفہ تھا۔

حادثہ یا تجلی؟—موت کی وادی کے کنارے۔۔۔۔تقدیر کے دروازے پر دستک۔۔۔

تقریباً تیس منٹ کے بعد اچانک منظر بدلا۔

بارش میں بھیگی سڑک، وقت نے وفا نہیں کی،

پہاڑی ڈھلوان

اور پانچ چھ سال کی ایک فرشتہ صفت بچی

جو اچانک سامنے آ گئی

بریک دبایا—مگر پہاڑی سڑک نے ساتھ نہ دیا۔ گاڑی کھائی کی طرف لڑھکنے لگی۔ پہیے پھسلے، جھاڑیاں ٹوٹیں، پتھر لڑکھڑائے—سرکتی ہوئی کار،

لرزتے ہوئے دل—اور قضا و قدر کے فیصلوں کا لمحہ۔ اور زندگی اپنی تمام یادوں سمیت آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگی۔

اسی لمحے ثمینہ آگے جھک کر **ڈیش بورڈ پر سجدے میں گر پڑی۔**

زبان پر کلمہ

دل میں یقین

اور شائد آنکھوں میں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی زیارت کا واسطہ!

آواز میں لرزش نہیں—عجب اطمینان

اس نے کہا نہ تھا؟

"اگر مولا نے بلایا تو سجدے ہی کی حالت میں حاضر ہوں گی۔"

—ہاں! سجدہ

کسی خوف زدہ انسان کا نہیں

کسی کامل یقین رکھنے والی روح کا۔

زبان پر کلمہ

آنکھوں میں قرار

دل میں رب سے ملاقات کی تڑپ

معجزہ—جو دیکھا بھی، پھر بھی سمجھ میں نہ آیا

گاڑی مسلسل نیچے جا رہی تھی

مگر اچانک ایک بڑا پتھر سامنے آیا

پہیے اس سے ٹکرائے

رفتار بدلی

زاویہ بدلا

پتھر نے گاڑی کا رُخ موڑ دیا

یوں لگا جیسے قدرت نے ہاتھ بڑھا کر باگ تھام لی ہو۔

گاڑی نے اپنا رُخ **پینتالیس درجے** موڑا—

منتظر، محافظ، مسخر کردہ۔ گاڑی اس سے ٹکرائی، ساکت ہو گئی، یوں لگا جیسے قدرت نے ہاتھ بڑھا کر باگ تھام لی ہو۔ سامنے ایک مضبوط درخت کھڑا تھا

کھائی منہ کھولے کھڑی تھی مگر ہمارا نام ابھی اس کے حصے میں نہیں لکھا گیا تھا۔

اور سامنے ایک مضبوط درخت جیسے صدیوں سے ہمارا منتظر کھڑا ہو، ہمیں تھامنے کے لیے کھڑا تھا۔

"آؤ، اس سے زیادہ آگے نہیں گرنے دوں گا"

کار اس سے ٹکرائی اور یوں رک گئی جیسے کسی ماں نے گرتے ہوئے بچے کو سینے سے چمٹا لیا ہو۔

کھائی نیچے کھلی تھی

مگر ہم اوپر ٹھہر گئے

جان سلامت

جسم بے خراش

صرف آنکھوں میں نمی

اور دل میں شکر

گاڑی رکی

کھائی رہ گئی

اور ہم بچ گئے

نہ ہڈی ٹوٹی

نہ جسم پہ خراش

صرف دل پر یہ آیت کندہ ہو گئی:

وَاللّٰهُ خَيْرٌ حَافِظًا

اللہ کا ہاتھ—جو نظر نہیں آتا مگر تھام لیتا ہے

لوگ آئے، نکالا، تسلی دی—اور ہم دونوں پر ایک بھی خراش نہیں آئی۔ گاڑی تباہ ہوئی، مگر دو زندگیاں محفوظ رہیں۔ یہی وہ مقام تھا جہاں انسان سمجھتا

ہے کہ

"زندگی ہمارے ہاتھ میں نہیں، ہمارے ہاتھ کسی اور کے ہاتھ میں ہیں۔"

سجدہ، آنسو اور بی بی زینبؑ کی یاد

اگلے دن جب ہم اس واقعہ کو دہرا رہے تھے تو ثمینہ نے کہا:

میں نے سجدہ اس لیے کیا تھا کہ بی بی زینبؑ کا وہ جملہ یاد آ گیا تھا: اے پروردگار! ہاتھ بندھے ہیں، جھک نہیں سکتی، مگر اسی حالت کا سجدہ قبول فرما۔

جب ہاتھ بندھے ہوں، جسم ٹوٹا ہو، جھکنے کی طاقت نہ ہو

تب بھی سجدہ صرف اسی کو زیب دیتا ہے۔

یہ یاد، یہ نسبت، یہ آنسو—حادثہ ٹل گیا مگر دل پر ایک نقوشِ جاوداں رقم ہو گیا۔

وہ بول رہی تھی

اور میرے دل میں ایسا لگا کہ روح کے نہاں گوشوں میں کسی نے چراغ رکھ دیا ہے۔

اے قارئینِ کرام

—یہ صرف یاد نہ تھی

یہ ولایت کی خوشبو تھی

یہ صبر کا استعارہ تھا

یہ عشقِ الٰہی کا اعلان تھا۔

صوفیانہ مسکراہٹ—جواب جو لفظوں میں نہ تھا

ساری گفتگو کے بعد اس نے پر سکون ہنسی کے ساتھ پوچھا

"تو بتائیے، راستے میں ان ترک عورتوں کو بڑے نوٹ دینے کا فائدہ ہوا یا نہیں؟"

میں نے جواب نہ دیا

کیونکہ جواب زبان سے نہیں

زندگی سے ملتے ہیں

ہم زندہ بیٹھے تھے

وہ ہمارا جواب تھا۔

میں خاموش ہو گیا—جواب لفظوں میں نہیں تھا، ہم دونوں کی زندگیاں خود جواب تھیں۔ اور یہ جواب کافی تھا۔

اختتامیہ تاثر ✨

یہ محض ایک حادثے کی داستان نہیں؛

یہ بتاتا ہے کہ

دوا، ہم کرتے ہیں — شفا وہ دیتا ہے
سفر ہم کرتے ہیں — حفاظت وہ کرتا ہے
بریک ہم لگاتے ہیں — گاڑی وہ روکتا ہے
...اور سجدہ
سجدہ تو بس ہمیں بہانہ دیتا ہے
اس کے قریب آنے کا۔
اللہ وہ ہے جو **کھائی کے کنارے بھی تھام لیتا ہے**
اور آنسو کو دعا بنا دیتا ہے۔
یہ اس رب کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے جو
مقلب القلوب بھی ہے، محیی الاموات بھی، اور ارحم الراحمین بھی۔
انسان چلتا ہے، قدم اس کے ہوتے ہیں
مگر حفاظت آسمانوں سے اترتی ہے۔

اے اللہ!
جو کھائی کے کنارے بھی تھام لیتا ہے
جو آنسو کو دعا بنا دیتا ہے
جو خوف کو سجدہ بنا دیتا ہے
ہمیں بھی وہ یقین عطا کر دے
جو حادثے کو کرامت بنا دے
اور سفر کو عبادت بنا دے۔
الحمدللہ رب العالمین۔

زندگی کا سب سے قیمتی سبق

برطانیہ میں جب کبھی گھر کا سودہ سلف خریدنا ہوتا تو میں اس کے ساتھ چل پڑتا۔ ایک مرتبہ فروٹ کے اسٹال پر انگور پڑے تھے، میں ایک انگور کے دانے کو توڑ کر صرف چکھنے کیلئے اپنے منہ میں ڈالنا چاہتا تھا کہ اگر میٹھے ہیں، تو ان کو خریدوں، اس نے فوری طور پر میرا ہاتھ پکڑ لیا کہ دوکاندار کی مرضی کے بغیر آپ یہ نہیں کر سکتے۔ میں نے کہا کہ میں اندر چل کر دوکاندار کو یہ بتادوں گا کہ میں نے ایک انگور کا دانہ کھایا تھا، اس کی بھی قیمت شامل کر لو

—اور پھر اُس کا وہ جملہ

جو شاید میری زندگی کا سب سے قیمتی سبق ہے

کیا آپ کے پاس ضمانت ہے کہ اگلا سانس آپ کو اجازت دے گا کہ دوکاندار کو بتا سکیں کہ آپ نے انگور کا دانہ چکھا تھا؟

—میں اُس لمحے لرز اٹھا تھا

اور یہ جملہ آج تک میری روح میں لکھا ہے۔

اُس ایک جملے میں

میں نے دین کی پوری اخلاقیات دیکھ لی تھی۔

—اور آج سوچتا ہوں

ثمینہ اپنے وجود میں ایک مکمل مکتب تھی۔

اس کی ہر خوبی،

ہر عادت،

—ہر نیکی

ایک مکمل درس تھی۔

اس کی زندگی ایک ایسی روشن مثال تھی جسے آنے والی نسلوں کو بتایا جانا چاہئے۔

میں نے یہ تحریر محض الفاظ کے لیے نہیں لکھی،

—بلکہ اپنی روح سے ایک بوجھ اتارا ہے

وہ بوجھ جو آٹھ سال سے مجھے

خاموشی کی قید میں رکھے ہوئے تھا۔

آج جب یہ مضمون مکمل ہوا تو یوں لگا جیسے

ثمینہ کی یادیں اب بوجھ نہیں،

بلکہ میرے دل کی روشنی بن گئی ہیں۔

ثمینہ سمیع.....

ایک ایسی عورت جس نے مشرقی حیاء کو

اپنی چادر کی طرح اوڑھ رکھا تھا،
جس نے زبان میں ایسی شیرینی رکھی
کہ بڑے سے بڑا مسئلہ
اس کی مسکراہٹ سے آسان ہو جاتا۔
وہ شوہر کی زندگی کی
ہر مشکل، ہر ذمہ داری، ہر سرد و گرم میں
یونہی شامل ہوئی
جیسے عبادت میں دل شامل ہوتا ہے۔
—میں جانتا ہوں
آج کا دور ایسے اخلاق،
ایسے صبر، ایسی وفا،
اور ایسی پاکیزگی سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔
اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ثمینہ کی یہ زندگی
...صرف میرا دکھ نہ رہے
بلکہ ایک درس بن جائے
ہر اُس بیٹی کے لیے جو گھر کو جنت بنا سکتی ہے،
ہر اُس بیوی کے لیے
جس کے صبر سے رحمتیں اترتی ہیں،
ہر اُس عورت کے لیے
جس کی دعا گھر کے در و دیوار میں برکت بھر دیتی ہے۔
اگر یہ تحریر آج
کسی ایک دل میں بھی
اپنے شریکِ حیات کے لیے
احترام، نرمی اور شکر کا جذبہ بیدار کر دے،
تو میں سمجھوں گا
کہ ثمینہ کی زندگی کا نور
دنیا میں ابھی بھی چل رہا ہے۔

آخر میں میں ربِ کائنات کے حضور
سجدۂ شکر بجالاتا ہوں
کہ اُس نے مجھے یہ ہمت دی
اور اللہ کی عطا کردہ توفیق سے یہ تحریر
میرے ہاتھوں مکمل ہوئی۔
شاید یہ میری زندگی کی
سب سے سچی، سب سے نرم
—اور سب سے مقدس تحریر ہے
کیونکہ یہ تحریر
میرے دل کے سب سے پاک رشتے پر لکھی گئی ہے۔
اللہ ثمینہ سمیع کے درجات بلند فرمائے،
اور ہم سب کو ایسے اخلاق، ایسی محبت
اور ایسی طہارت سے نوازے
جو گھروں کو واقعی جنت بنادے۔
آمین۔

سفر آخرت

—اور آخر میں

رب نے اسے رخصت بھی کیسے کیا؟

جب ایک پاک روح رخصت ہوتی ہے اور آسمان اپنے دروازے کھول دیتا ہے.....

ثمینہ کی رخصت میرے لئے قیامت تھی،

—لیکن اس کی رحلت کا انداز خود یقینی کا درس تھا

ایک ایسی خاتون کہ جس نے زندگی قرآن کے نور میں گزاری،

—رب نے اسے دنیا سے رخصت بھی اسی نور کی سب سے روشن رات میں کیا

دنیا کی سب سے پاکیزہ رات:

رمضان المبارک.....شبِ قدر۔ 27

وہ رات جس میں فرشتے اترتے ہیں،

جس میں تقدیریں لکھی جاتی ہیں،

جس میں آسمان کے دروازے پوری طرح کھل جاتے ہیں۔

—اور اسی رات اس کا نام وہاں تحریر ہوا

ثمینہ سمیع، میری بندگی میں سرخرو،

میرے پاس لوٹ آؤ.....

اور نمازِ جنازہ.....

جمعۃ الوداع

جس میں اس کی نمازِ جنازہ ادا ہوئی۔

کیا اتفاق.....؟

یا کیا کرم.....؟

یا کیا قبولیت.....؟

جب اس کی لحد اتاری گئی تو فضا میں وہ باریک، شفاف،

تو مہکی ہوئی بارش برسنے لگی، وہ بھیگی ہوئی دعاؤں جیسی خوشبو.....

—وہ بارش زمین پر نہیں

دلوں پر گر رہی تھی۔

جیسے رحمت کہہ رہی ہو:

شاید آسمان خود کہہ رہا تھا:

ثمینہ !خوش آمدید.....

ثمینہ !یہ راستہ بھیگتا ہوا تیرے لئے سجایا گیا ہے۔

اور شاید اسی لئے

میں نے اپنی برسوں کی جھجک،

اپنی مشرقی حیا کی دیوار،

—اپنی کمزوری اور گریۂ دل

سب کو ایک طرف رکھ کر

یہ تحریر لکھ دی ہے۔

کیونکہ سچ چھپایا نہیں جاتا۔

اور اس کی پاکیزگی، اس کی وفاداری،

—اس کی عبادت گزاری

یہ سب سچ تھے جنہیں زمانہ جاننے کا حق رکھتا ہے۔

—آج اس تحریر کے اختتام پر میں جانتا ہوں

کہ میں نے اپنے دل کا قرض اتار دیا ہے۔

میں نے ثمینہ کی زندگی، کردار، نیکی اور نور کو

الفاظ کی شکل میں دنیا کے سامنے رکھ دیا ہے۔

روشنی کی پہلی کرن — ابتدائی زندگی اور دینی تربیت

شہر کی قدیم گلیوں میں
جو صبح کی پہلی روشنی میں بھی خاموش رہتی تھیں،
وہاں ایک گھر تھا جس کی چھت پر ہمیشہ دعا کی مہک رہتی۔
اسی گھر میں پیدا ہوئی تھیں ثمینہ سمیع،
ایک ایسی بچی جس کے وجود میں
اللہ کا خوف اور محبت کے بیج پہلے ہی بوئے جا چکے تھے۔
بچپن ہی سے
ثمینہ کی نگاہیں قرآن کی جانب جھکتی تھیں،
اور اس کی آنکھوں میں
نماز اور تسبیح کا نور روشن ہوتا تھا۔
چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی
—وہ رب کی یاد میں مگن رہتی
گھر کے گوشے، درختوں کے سائے، پانی کی روانی
سب کچھ اس کے لیے ذکرِ الٰہی کی ایک شکل بن گیا۔

اس کی والدہ محترمہ مرحومہ اکثر کہتیں:
یہ بچی خاص ہے، رب کے نزدیک خاص ہے۔"
—دیکھو اس کی آنکھوں کی روشنی
"یہ دنیا کی روشنی نہیں، رب کی روشنی ہے"۔

روشنی کی پرورش

ثمینہ کی تربیت گھر کے ماحول میں ہوئی،
جہاں صوم اور نماز کی پابندی معمول تھی،
اور خوفِ خدا کو ہر کام کی بنیاد بنایا جاتا۔
لیکن یہ خوف کبھی سختی میں نہ ڈھلا،
بلکہ یہ ایک لطیف، نرم روشنی کی صورت تھا،
جو ہر قدم پر اس کے دل کو ہدایت دیتا۔
گھریلو ماحول میں قرآن کی تلاوت کی عادت تھی۔

اس نے ہر آیت کو صرف یاد نہیں کیا،
بلکہ اس کے مفہوم کو دل میں اتارا،
اور ہر آیت پر غور کرتے ہوئے اپنی روح کو سنوارا۔

طفلی عشقِ نبوی ﷺ

چھوٹے چھوٹے قدموں سے
ثمینہ نے رسول اللہ ﷺ کے عشق کی پہلی جھلک دیکھی۔
ہر درود میں، ہر سجدے میں، ہر ذکر میں
وہ ایسی بے خودی میں غرق ہوتی کہ
محسوس ہوتا جیسے روح کہیں بلند ہو رہی ہو۔

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ خانہ کعبہ کے سامنے ہم دونوں بیٹھے تھے، میں نے اچانک سسکیوں کی آواز سنی، ثمینہ پوری کوشش سے اپنے منہ میں احرام کی چادر لئے اپنی آواز کو دبانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن گویا اندر کا منہ زور تلاطم بغاوت پر اتر آیا:
میں نے حوصلہ دینے کی بالکل کوشش نہیں کی کیونکہ مجھے اپنی ناکامی کا پہلے سے اعتراف ہو چکا تھا۔ اس نے اچانک مجھ سے ایک ایسا سوال پوچھ لیا "کیا آپ مجھ سے راضی اور مطمئن ہیں؟ اس کے جواب میں اب میرے اندر کا کڑکتا طوفان ابل پڑا، میری ساری مردانگی اس سوال کے سامنے ڈھیر ہو گئی اور پوری کوشش کے باوجود میری آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی گویا کسی نے میری طاقتِ گویائی کو سلب کر لیا ہو۔ میں نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر صرف اشارے پر اکتفا کیا کہ تم نے بشری تقاضوں کے باوجود کبھی ایسا موقع نہیں دیا اور یہ سوال تو مجھے پوچھنا چاہئے تھا، تم یہاں بھی سوال میں پہل کر کے مجھے شکست سے دوچار کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

حرم میں داخل ہونے سے قبل اس نے مجھ سے کعبہ پر پہلی نگاہ پڑنے کی دعا کی اہمیت اور قبولیت کے بارے میں جب پوچھا تو میں نے مستجاب الدعا کا ذکر کیا: اے میرے کریم و رحیم رب، میری زندگی میں تمام دعائے حسنات کو قبولیت کا درجہ عنائت فرما۔ یہ سننا تھا کہ اس کا چہرہ گلنار ہو گیا کہ اس طرح تو زندگی میں مانگی جانے والی تمام دعاؤں کی قبولیت کی ضمانت مل گئی۔ میں گزشتہ کئی دنوں سے مسلسل اس اضطراب میں تھی کہ بہت سی قلبی دعائیں قطار کے اندر ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کیلئے ملتمس تھیں۔ آپ نے مسئلہ حل کر دیا۔

عمرہ کی سعادت کے بعد میں نے یونہی اس سے پوچھ لیا کہ آپ نے خانہ کعبہ پر پہلی نظر پڑتے ہی کیا دعا مانگی؟ اس کے جواب سے میں چونک گیا: کہ میں نے کریم رب سے رحیم رب کو ہی مانگ لیا، اور اس کے بعد کچھ یاد نہیں کہ اس کے عظیم خزانے سے کیا مانگا؟
اس کے طویل رکوع و سجود کی کیفیت بیان کرنے کیلئے الفاظ کہاں سے مستعار لوں جو صحیح تفسیر بیان کر سکیں۔
کبھی کبھار وہ کھڑکی کے پاس کھڑی ہو کر ہلکی سی سرگوشی میں کہتی:
"یا رسول اللہ ﷺ":
مجھے اپنے رب کی رضا کے لیے

ایسی قربانیاں دینے کی توفیق عطا فرما۔
جو مجھے آپ کی محبت میں سرشار کر دے
اس کی یہ ابتدائی تربیت
بعد میں اس کی زندگی کا مرکزی محور بن گئی،
جو نہ صرف عبادت بلکہ خدمت اور قربانی میں بھی نمودار ہوئی۔

اولین کہانی: خدمت بطور عبادت
چھوٹی عمر ہی میں
ثمینہ نے اپنے گھر کے ماحول میں
خدمت کو عبادت کا درجہ دے دیا۔
گھریلو کام، والدین کی مدد، اور معاشرتی ذمہ داریوں میں
وہ ایک سرشار نوجوان کے جذبات کے ساتھ پیش آتی،
اور ہر عمل کو رب کی رضا کے لیے کرتی۔
مسافرِ حدیث جب اس سے ملا،
تو پہلی ملاقات میں ہی محسوس کر گیا
— کہ یہ عورت محض شریکِ حیات نہیں
بلکہ ایک روحانی رہنما ہے،
جو دل کی خاموش آواز کو سمجھتی ہے،
اور ہر الفاظ کے پیچھے موجود حقیقت کو پڑھ سکتی ہے۔

پہلا سبق: خوفِ خدا اور محبتِ رسول ﷺ کا امتزاج

ثمینہ کی زندگی کا پہلا سبق یہی تھا:
کہ خوفِ خدا
صرف کانوں کے لیے نہیں،
بلکہ دل کی گہرائیوں میں محسوس کیا جائے۔
اور محبتِ رسول ﷺ
ایسی ہو کہ دل کی ہر دھڑکن،
ہر سانس، ہر نظر،
اور ہر عمل میں جھلک دے۔
اسی باب کے اختتام پر
یہ بات واضح تھی کہ
یہ لڑکی
—صرف انسان نہیں
ایک روشنی کی کرن تھی
جو آنے والے زمانے میں
مسافرِ حدیث کی زندگی کا محور بنے گی۔

چاندنی میں جھلکتا نور کا بیج
قدم قدم پر بڑھا، رب کی رضا کے لیے
بچپن کی دعاؤں میں چھپی خواہش
آج بھی ہر دل کے لیے چراغ بنے
...ثمینہ سمیع
"ایک نام، ایک نور، ایک عبادت

عشقِ مدینہ — حدیثِ رفاقت کی پہلی جھلک

شہر کی خاموش رات میں
جب چاند کی روشنی مزار کے صحن پر پھیل رہی تھی،
تب مسافرِ حدیث پہلی بار
ثمینہ سمیع کے سامنے کھڑا ہوا۔

وہ ہاتھ میں تسبیح لیے،
چہرے پر نور اور آنکھوں میں خاموشی کا سمندر لیے
کھڑی تھی۔
اس کی موجودگی
—صرف جسمانی نہیں تھی
یہ حضورِ الٰہی کی ایک جھلک تھی
جو زمین پر اتری ہو۔

پہلی ملاقات—دل کی پہچان

مسافرِ حدیث نے دھیرے سے پوچھا:
"آپ کون ہیں؟"
ثمینہ نے نرم آواز میں جواب دیا:
میں وہ ہوں جو دلوں کی خاموشی سنتی ہوں،
جو رب کی محبت کو ہر لب و نظر میں محسوس کرتی ہوں۔
کہ خاموشی کا ادب کرو کہ یہ آوازوں کی مرشد ہے،
مجھے اس جواب کی سمجھ اس کے دنیا سے رخصت ہونے کے کئی برس بعد مل گیا کہ تحریر خاموشی کی زبان ہے۔
یہ لمحہ
—صرف ایک سلام یا تعارف نہیں تھا
یہ ایک **روحانی شناخت** تھی،
جو دونوں کے دلوں کے درمیان
حدیثِ رفاقت کی بنیاد بنی۔

مدینہ کی سرشاری—عشقِ نبوی ﷺ کا تجربہ

چند ہفتے بعد، دونوں مدینہ منورہ کی زیارت کے لیے گئے۔
ثمینہ کی حالت وہاں ایسی بدل گئی
جیسے روح جسم سے آزاد ہو رہی ہو۔
مسافرِ حدیث نے محسوس کیا کہ:
اس کی آنکھیں روشنی سے بھر گئی ہیں
سانسوں میں ایک لرزش، ایک سرور ہے

ہر لفظ، ہر سرگوشی، درودِ رسالت ﷺ کی طرح نکل رہی ہے
وہ خاموشی سے لبوں پر کہہ رہی تھی:

یارسول اللہ ﷺ!

...میں آپ کی محبت میں سرشار ہو گئی ہوں
"اگر اب دم نکل جائے، تو بھی خوش ہوں۔

مسافرِ حدیث نے اسے سہارا دیا،
—مگر اس کے دل میں بھی ایک عجیب سکون اور خوف تھا
یہ عورت اپنے رب کی محبت میں اس حد تک غرق ہو گئی تھی
کہ اب دنیا کا کوئی بوجھ اسے چھو نہیں سکتا تھا۔

حدیثِ خدمت—زندگی کو عبادت بنا دینا

ثمینہ نے گھر واپس آ کر
مسافرِ حدیث کی خدمت کو عبادت سمجھنا شروع کیا۔
ہر کھانا تیار کرنا، ہر گھریلو ذمہ داری،
ہر چھوٹا قدم
رب کی رضا کی تلاش کا ایک حصہ بن گیا۔

مسافرِ حدیث اکثر سوچتا:

یہ عورت محض شریکِ حیات نہیں،
یہ میری روح کی ہدایت ہے۔
یہ میری تحریروں کا نور ہے،
"میری ہر تحریر کی روح ہے۔

پہلا مشترکہ سفر—صوفیانہ مکالمے

رات کے پہر، دونوں مزار کے آنگن میں بیٹھے،
چاند کی روشنی میں مسافرِ حدیث نے پوچھا:
"کیا تم واقعی اپنے رب سے صرف اپنی ذات کے لیے دعا نہیں کرتی؟
ثمینہ نے مسکرا کر جواب دیا:
نہیں... ایسا نہیں"
میری ہر دعا میں آپ بھی ہیں،

میری ہر خواہش میں دنیا کی خیر بھی،
میری ہر سانس میں اللہ کا خوف بھی،
"اور رسول ﷺ کی محبت بھی۔
یہ گفتگو
صرف مکالمہ نہیں،
یہ دو دلوں کی **حدیثِ نور** تھی،
جو بعد میں آنے والے ہر امتحان کا محور بنی۔

مدینے کی گلیوں میں جب قدم رکھا"
روح بے خود ہو گئی، دل سرشار ہو گیا
ثمینہ سمیع کی ہر سانس
حدیثِ عشقِ نبوی ﷺ میں ڈوب گئی
مسافرِ حدیث نے دیکھا
کہ یہ روشنی، یہ نور
"اب زندگی کے ہر لمحے میں ساتھ رہے گا

عبادتِ خدمت — گھریلو زندگی اور عشقِ نبوی ﷺ

شہر کی گلیوں سے کچھ فاصلے پر،
ایک چھوٹا سا گھر تھا جہاں ہر دیوار پر
خاموشی اور نور کا کھیل چلتا تھا۔
یہ گھر اب صرف رہائش کی جگہ نہیں رہا تھا،
بلکہ ایک **روحانی گواہ گاہ** بن چکا تھا،
جہاں ہر عمل، ہر قدم، ہر سانس
اللہ کی رضا اور رسول ﷺ کی محبت کی ایک جھلک پیش کرتا تھا۔

ثمینہ سمیع — خدمت میں سرشار

ثمینہ سمیع
صرف شریکِ حیات نہیں تھی،
بلکہ ایک **روحانی رہنما** تھی،
جس نے زندگی کے ہر لمحے کو عبادت میں بدل دیا۔

کھانا پکانا
گھر کی صفائی
مسافرِ حدیث کی ہر ضرورت
اور روزمرہ کے چھوٹے بڑے کام
یہ سب اس کے لیے عبادت کے برابر تھے۔
وہ اکثر کہتی:

آپ کی خدمت میرے لیے عبادت ہے،
آپ کی خوشی میرے رب کی رضا ہے،
"اور آپ کا ہر دکھ میری دعا کا حصہ ہے۔

مسافرِ حدیث اکثر سوچتا:

یہ عورت محض شریکِ حیات نہیں،
یہ میری روح کی رہنمائی،
میری تحریروں کی روشنی،
"میری ہر دعا کی حقیقت ہے۔

حدیثِ نور — روزانہ کا سفر

رات کے پہر، جب شہر کی گلیوں میں سکوت چھا جاتا،
ثمینہ اور مسافرِ حدیث مزار کے آنگن میں بیٹھتے،
اور وہ دن بھر کے واقعات، مصائب، خوشیاں،
اور اللہ کی یاد میں غرق ہو جاتے۔
مسافرِ حدیث اکثر پوچھتا:

"تم روزانہ اتنی عبادت کس طرح کر لیتی ہو؟

ثمینہ مسکرا کر جواب دیتی:

یہ عبادت نہیں، یہ روشنی ہے،
یہ خدمت نہیں، یہ عشقِ نبوی ﷺ کی جھلک ہے۔
جب ہماری زندگی کی ہر لمحے میں
رب کا خوف اور محبت موجود ہو،
تو ہر کام عبادت بن جاتا ہے۔

روحانی مکالمہ — دل کی سچائی

ایک رات، دونوں مزار کے صحن میں بیٹھے،
مسافرِ حدیث نے دل کی گہرائی سے کہا
ثمینہ! تم نے میری زندگی کو نور دے دیا۔"
اگر تم نہ ہوتیں، تو میرے قلم کی روشنی بھی نہ ہوتی۔
تمہارے بغیر میری ہر تحریر خالی رہ جاتی۔
ثمینہ نے نرم آواز میں جواب دیا:
یہ نور ہمارے نہیں،
یہ اللہ کا نور ہے جو ہم دونوں کے دلوں میں بس گیا ہے۔
میری دعا ہے کہ جنت میں بھی
ہم ساتھ رہیں،
اور ہر لمحہ اللہ کی رضا کے لیے زندہ رہیں۔

ہر صبح میں تمہارے لیے دعا کی روشنی لائی
ہر رات میں تمہارے سکون کے لیے تسبیح کی گھڑی رکھی
ثمینہ سمیع کی ہر حرکت، ہر سانس
حدیثِ عبادت اور عشقِ رسول ﷺ میں ڈوبی
یہ زندگی نہیں، ایک عبادت تھی،
اور یہ گھر، ایک نورانی مزار بن گیا

نور کی وارث: ثمینہ سمیع کے چند لازوال چراغ

زندگی میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو خود تو چلے جاتے ہیں مگر اپنے پیچھے چلتی پھرتی روشنی چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کے کردار کی خوشبو، ان کی باتوں کی حرارت، ان کی مسکراہٹ کی روشنی اور ان کے عمل کی گونج... برسوں تک دلوں کے اندر سفر کرتی رہتی ہے۔
ثمینہ سمیع بھی انہی چراغوں میں سے ایک تھی — ایک ایسا چراغ جس نے بجھ کر بھی کئی گھروں اور دلوں میں اپنی روشن لو چھوڑ دی۔
یہ باب دراصل انہی چند واقعات کا ہے جن میں اس عظیم عورت کی ذہانت، وقار، شجاعت، علم، اور ایمان کا وہ پہلو جھلکتا ہے جو اسے منفرد بناتا ہے۔

ایک جواب جس نے برطانوی پارلیمنٹ تک کو خاموش کر دیا

اللہ نے ثمینہ کو حیرت انگیز حافظہ، حاضر جوابی، اور ایسی مدلل گفتگو عطا کی تھی کہ سامنے والا بے ساختہ مسکرا اٹھتا، اور پھر خاموش ہو جاتا۔

ہمارے پڑوس میں برطانیہ کی پارلیمنٹ کی ایک منتخب رکن روپا، ثمینہ کی بے تکلف اور نہایت قریبی دوست تھی۔

روپا خود ثمینہ کی رحلت پر تعزیت کے لئے آئی تو پلکوں پر آنسو لرز رہے تھے، اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ بولنے لگیں:

ایک دن میں نے تمہاری بیوی ثمینہ سے بہت ہی عجیب سا سوال کر لیا... میں نے پوچھا"

ثمینہ! تم ہمیشہ اپنے شوہر کے پیچھے چلتی ہو۔ کیا تمہارے معاشرے میں عورت کو کم تر سمجھا جاتا ہے؟

پھر یوں لگا جیسے اس ذاتِ پاک نے ثمینہ کو صرف محبت اور ایثار ہی نہیں دیا تھا بلکہ ذہانت، فہم، حاضر جواب طبیعت اور دلیل کا گوہر بھی عطا کیا تھا۔

اس کا حافظہ... سبحان اللہ! جیسے پوری دنیا کے صفحات ایک ایک کر کے اس کے ذہن میں سجے ہوئے ہوں۔

یہ کہتے ہوئے روپا کی آواز رُک گئی، آنکھیں بھر آئیں۔ روپا نے کہتے ہوئے چہرہ تھام لیا، پھر آہستہ سے مسکرا کر اس کا جواب دہرانے لگی:

پھر اُس نے وہ لمحہ دہرا کر بتایا:

ثمینہ ہنس پڑی، اور مجھے دیکھ کر آہستہ مگر بڑے پر اعتماد لہجے میں میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میری طرف متوجہ ہو کر جو جواب دیا، وہ میری ساری عمر کی سیاست کا نچوڑ رکھ دیا۔

روپا! یہ کیسا بچکانہ سا سوال کر دیا تم نے؟

مجھے بتاؤ، کیا تم نے ٹی وی پر اپنی ملکہ کو نہیں دیکھا؟

وہ ہمیشہ اپنے گارڈ کے پیچھے چلتی ہے

...ہمیشہ اس کا گارڈ اس کے آگے چلتا ہے، اور وہ اس کے پیچھے

تو یہ بھی میرا گارڈ ہے... میرا محافظ... میں اس کی سایہ داری میں، اس کے پیچھے پوری عزت، اطمینان اور سکون کے ساتھ چلتی ہوں۔

روپا کہنے لگی:

میں اس جواب پر چند لمحے خالی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

یہ جواب نہیں تھا—یہ عورت کی عزت کا منشور تھا!

—روپا کہنے لگی کہ اس نے یہ بات پارلیمنٹ میں اپنی تقریر میں سنائی

اور کہا کہ یہ وہ کلچر ہے جہاں عورت کمزور نہیں، محترم ہوتی ہے۔

...مسلمان عورت اپنے مرد کے پیچھے کمزوری سے نہیں

"عزت، اعتماد اور تحفظ کے احساس سے چلتی ہے۔

یہ جواب نہیں تھا... یہ تہذیب کی فتح تھی۔

پردہ پابندی کے خلاف ایک روشنی کی مہم

اور پھر وہ دن آیا جس نے پورے برطانیہ کی سیاست میں ایک عجیب سا چرچا پیدا کیا۔ اس دوران پورے یورپ میں مسلم خواتین کے مخصوص پردے پر پابندی کی تحریک زوروں پر تھی۔۔ ایک ملک میں قانون پاس ہو گیا، دوسرے میں بحث چل رہی تھی۔ قانون بنتے جا رہے تھے، ڈراؤنا ماحول پیدا کیا جا رہا تھا۔

لیکن ثمینہ... سبحان اللہ... وہ تو ہمیشہ ہی سچائی کے محاذ پر پہلی صف میں کھڑی نظر آتی تھی۔

ثمینہ تو وہ عورت تھی جو ظلم کے سامنے خاموش رہنا گوارا نہیں کرتی تھی

چند مقامی خواتین کو ساتھ لیا، اور لندن کے بڑے بڑے مالز میں ایک چھوٹا سا اسٹال لگا دیا۔

ہر گزرنے والی انگریز خاتون کو محبت سے سکارف کا چھوٹا سا تحفہ دیا جاتا، اور اسلام میں پردے کی سائنسی و اخلاقی اہمیت پر مشتمل ایک مختصر سا بروشر بھی۔

نہ بڑے فنڈ،

...نہ کوئی حکومتی سپورٹ

صرف ایک سکارف، ایک بروشر، اور ایک سچا دل۔

ہر انگریز خاتون کو وہ محبت سے اپنی پسند کا ایک سکارف کا انتخاب کرنے کیلئے کہتی، پھر اسے قد آدم آئینے کے سامنے بٹھا کر تصویر لیتی۔

سکارف باندھتی، اور کہتی:

"اب خود فیصلہ کرو... کیا یہ تمہیں اچھا نہیں لگا؟"

اور پھر... وہ منظر خود دیکھنے والا ہوتا۔

...اور ہر انگریز خاتون

...ہر نوجوان لڑکی

—ہر ایک انگریز عورت جب آئینے میں اپنا نیا روپ دیکھتی تو حیران رہ جاتی

آنکھوں میں چمک، چہرے پر وقار، اور دل میں ایک عجیب سا اطمینان۔

وہ خوشی سے بھر جاتی اور اپنا رابطہ نمبر دے کر رخصت ہوتی۔

چند ہی ہفتوں میں اس چھوٹے سے قدم نے پورے شہر کا نقشہ بدل دیا۔

چند ماہ میں اس تحریک نے پورے لندن اور پھر دیگر شہروں میں ڈیرے ڈال دیے۔

لندن، مانچسٹر، لیڈز.....

ہر طرف ایسے اسٹال لگنے لگے۔

...درجنوں اسٹال، سینکڑوں خواتین، اور پھر ہزاروں انگریز عورتیں،

یہ سب مل کر اس بل کے سامنے دیوار بن گئیں۔

ہزاروں غیر مسلم خواتین اس تحریک کا حصہ بن گئیں

—اور یوں وہ بل جسے مسلم خواتین کی آزادی سلب کرنے کے لیے استعمال ہونا تھا
ہزاروں غیر مسلم عورتوں کی آواز نے روک دیا۔
نتیجہ ؟
...برطانیہ نے پردہ پابندی کے خلاف وہ مضبوط قدم اٹھایا جو پورے یورپ میں مثال بن گیا
اور آج بھی اس مہم کا اثر پورے یورپ میں محسوس ہوتا ہے۔

واٹرلو کی قبریں اور ایک حرفِ نصیحت

... ثمینہ کی شخصیت صرف خدمت، نرمی اور کردار تک محدود نہ تھی

وہ ایک شاندار قانون دان تھی،

عالمی تاریخ میں بھی ماسٹرز کر رکھا تھا،

ثمینہ کی علمی وسعت کا ایک منظر اور اس کی ذہانت و یاداشت کی گہرائی کا ایک پہلو میں نے اپنی آنکھوں سے واٹرلو کے میدان میں اس دن دیکھا جب ہم دونوں یورپ کی سیر پر تھے۔

—واٹرلو کے میدان کے قریب وہ بڑا تاریخی قبرستان جہاں جنگِ عظیم کے ہزاروں سپاہی سو رہے ہیں

...وہاں پہنچے تو بھیڑ تھی، سیاح تھے، گائیڈز تھے

لیکن نجانے ثمینہ کے دل میں کیا اترا کہ وہ رک کر بولنے لگی۔ قبروں کی طرف دیکھا اور بولنا شروع کر دیا۔

اس نے چند لمحوں میں جنگِ عظیم کی تاریخ اس روانی سے بیان کی کہ کئی سیاح رک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ سوال کرتے اور وہ اتنی نرمی اور علم سے جواب دیتی کہ لوگ حیران رہ جاتے

وہ بتانے لگی کہ فلاں جنگ میں کیا ہوا، فلاں کمانڈر نے کیا غلط فیصلے کیے، کس ملک نے کس کو کس وجہ سے دھوکہ دیا.....

آہستہ آہستہ آس پاس کے سارے سیاح خاموش ہو گئے۔

سب اسے سننے لگے.....

سوال کرتے.....

اور جواب میں ثمینہ علم، دلیل اور گہرائی کے وہ موتی بکھیرتی جاتی۔

پھر آخر میں اس نے ایک ایسی بات کہہ دی کہ کئی چہروں کا رنگ بدل گیا

—پھر آخر میں وہ بولی

وہ جملہ جو کئی دلوں میں آج تک محفوظ ہے:

چودہ صدیاں پہلے ہمارے نبی ﷺ نے قبرستان جانے کی تاکید اسی لیے فرمائی تھی کہ انسان موت کو یاد رکھے۔

... آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے ملکوں کے حکمران بھی قبرستانوں میں آیا کریں

تاکہ انہیں یاد رہے کہ جو اسلحہ وہ تیسری دنیا کو بیچتے ہیں،

وہ دراصل ان کے قبرستانوں کو بڑا کر رہا ہے۔

اگر دنیا کو بدلنا ہے تو قبرستانوں کی خاموش تعلیم کو سمجھنا ہو گا۔

اگر دنیا بدلنی ہے.....

تو موت کو یاد کرنا ہو گا۔

سیاح یک دم سنبھل نہ سکے۔

وہیں ایک چھوٹا سا گروپ بن گیا جس میں کئی ملکوں کی خواتین شامل تھیں۔
نمبروں کا تبادلہ ہوا
سیاحوں نے وہیں اپنے رابطہ نمبر ایک دوسرے کو دیے،
اور یوں ثمینہ کا ایک بین الاقوامی رابطہ گروپ بن گیا جو مختلف ملکوں کی غلط پالیسیوں پر آواز اٹھاتا رہا۔
اور پھر برسوں تک وہ گروپ سیاسی فیصلوں پر اثر انداز ہوتا رہا۔

باباب: حُسنِ ہمسائیگی — نیکی جو لوٹ آتی ہے

ثمینہ کا اپنے ہمسایوں کے ساتھ حُسنِ سلوک محض ایک عادت نہیں تھا، بلکہ اس کے ایمان کی عملی تعبیر اور حُسنِ عمل کا عملی اظہار تھا۔ اس کا یقین تھا کہ نیکی وہ نہیں جو دکھاوے میں ہو، بلکہ وہ ہے جو خاموشی سے دلوں کو جوڑ دے۔ اور اللہ کے ہاں وزن رکھتی ہو۔ گھر میں جب کبھی کوئی خاص پکوان تیار ہوتا، یا احباب کے لیے دعوت و طعام کا اہتمام کیا جاتا، تو وہ بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے ارد گرد رہنے والی تمام عمر رسیدہ انگریز ہمسایہ خواتین کے لیے علیحدہ علیحدہ ڈبے تیار کرتی۔ پھر وہ خود انہیں تھامے ایک ایک دروازے پر جاتی، مسکراتے چہرے کے ساتھ، جیسے کسی فرض کی ادائیگی کر رہی ہو، جیسے کوئی خوشی بانٹنے نکلی ہو۔

میں کئی مرتبہ اسے سمجھانے کی کوشش کرتا کہ خدانخواستہ اگر کسی ہمسائے کی طبیعت خراب ہو گئی تو اس نیکی کے لینے کے دینے پڑ سکتے ہیں۔ مگر وہ ہمیشہ اسی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیتی، جس حلال کھانے کو پکاتے وقت درود شریف پڑھا جائے، اور جسے اس نیت سے ہمسائے کے گھر بھیجا جائے کہ ہمارے آقا ﷺ نے ہمسایوں کے بہت حقوق بیان فرمائے ہیں، اُس میں پھر کسی اندیشے کی گنجائش نہیں رہتی۔

ہماری دائیں جانب پڑوس میں مسز فلاور رہتی تھیں — عمر کی دہلیز بہت پیچھے چھوڑ چکی تھیں، اکیلی تھیں اور جزوی طور پر معذور بھی۔ گزشتہ کئی برسوں سے ثمینہ ان کی دیکھ بھال ایسے کرتی رہی جیسے کوئی بیٹی اپنی ماں کی کرتی ہے۔ کبھی ان کے گھر جا کر دوائیں پوچھنا، کبھی کھانا دینا، اور کبھی گھنٹوں گھر کے عقبی باغ میں ان کے ساتھ بیٹھ کر دنیا جہان کی باتیں کرنا — صرف اس لیے کہ اس بوڑھی عورت کو تنہائی کا احساس نہ ہو۔ وہ تنہائی، جو مغربی معاشروں میں بوڑھوں کی خاموش موت کا سب سے بڑا سبب بن جاتی ہے۔

پھر وہ دن آ گیا جب اچانک ثمینہ کی طبیعت بگڑ گئی۔ ایمبولنس بلائی گئی تو محلے کی تمام بوڑھی ہمسایہ خواتین بے چین ہو کر اس کے گرد جمع ہو گئیں۔ دعاؤں، آنسوؤں اور لرزتی آوازوں کے ساتھ انہوں نے اسے رخصت کیا۔ مگر مسز فلاور، اپنی معذوری کے باعث، صرف کھڑکی سے ہاتھ ہلاتی رہ گئیں — آنکھوں میں وہ درد تھا جو الفاظ کا محتاج نہیں ہوتا۔ ہسپتال پہنچنے کے چند ہی گھنٹوں بعد ثمینہ پر موذی فالج کا حملہ ہو گیا اور اسے فوراً انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔

اگلی صبح جب اچانک گھر کے دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے گھبرا کر دروازہ کھولا۔ سامنے مسز فلاور دیوار کے سہارے کھڑی تھیں۔ میں حیرت سے انہیں دیکھتا رہ گیا — وہ جو ہمیشہ ویل چیئر پر، معاون نرس کے ساتھ گھر سے نکلتی تھیں، آج تنِ تنہا یہاں تک کیسے پہنچ گئیں؟ میں نے فوراً انہیں تھام لیا، کہ کہیں وہ گر نہ جائیں۔ بڑی مشکل سے انہیں اندر لایا تو وہ بے حد پریشانی کے عالم میں ثمینہ کا حال پوچھ رہی تھیں۔

وہ لمحے میری زندگی کے سب سے کٹھن لمحے تھے۔ زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ جب میں نے انہیں ثمینہ کی تمام حالت بتائی تو وہ ایک ماں کی طرح مجھے تسلی دینے لگیں، ہسپتال کی تفصیلات پوچھتی رہیں۔ میں نے ان کی صحت کے پیشِ نظر انہیں وہاں آنے سے منع کیا اور بڑی احتیاط سے واپس گھر پہنچا دیا۔

مگر چند ہی گھنٹوں بعد میں نے وہ منظر دیکھا جو عمر بھر میرے دل پر نقش ہو گیا۔ مسز فلاور اپنی معاون نرس کے ساتھ، ہاتھ میں پھول لیے، ویل چیئر پر ہسپتال کے کمرے کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ میں نے لپک کر ان کی ویل چیئر کو ثمینہ کے بستر کے قریب کر دیا۔ ثمینہ بے ہوش تھی، مگر مسز فلاور نے

اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ وہ اس سے ایسے باتیں کر رہی تھیں جیسے وہ سب کچھ سن رہی ہو۔ کبھی اس کا ہاتھ چومتی تھیں، کبھی اس کے کان میں سرگوشیاں کرتیں، اور کبھی دعاؤں کے آنسو اس کے ہاتھوں پر ٹپک جاتے۔

تقریباً ایک گھنٹے تک وہ محبت، دعا اور وفا کے زمزمے بہاتی رہیں۔ جب رخصت ہونے لگیں تو میں نے بھرائی ہوئی آواز میں ان سے ثمینہ کی صحت یابی کی دعا کی درخواست کی۔ اس پر انہوں نے دو جملے کہے—اور وہ دونوں جملے کسی ضخیم کتاب سے کم نہ تھے۔ جو میری زندگی کا سرمایہ بن گئے:

کہنے لگیں:

میرے بیٹے! میں اڑتیس سال بعد پہلی مرتبہ ثمینہ کی صحت کے لیے دعا کرنے چرچ گئی ہوں، اور سیدھی وہاں سے اسے دیکھنے آئی ہوں۔

پھر رک کر بولیں:

اور ایک بات یاد رکھنا—اس کی لمبی عمر کی دعا مت کرنا، صرف صحت یابی کی دعا کرنا۔ اللہ نے ہماری موت کا دن پہلے ہی مقرر کر رکھا ہے، وہ ٹل نہیں سکتا۔ بس دعا یہ کرو کہ جو وقت باقی ہے وہ صحت کے ساتھ گزرے۔

مسز فلاور کا اڑتیس برس بعد چرچ جانا، اور پھر یہ نصیحت—اس نے میرے دل پر مہر ثبت کر دی۔ اس دن مجھے یقین ہو گیا کہ نیکی کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ انسانیت کے لیے کیا گیا کوئی عمل ضائع نہیں ہوتا۔ پھر سوچتا ہوں کہ ثمینہ نے تو یہ سب کچھ کسی صلے، کسی شکریے یا کسی بدلے کے لیے نہیں کیا تھا؛ وہ تو یہ سب صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی کے لیے کرتی رہی۔ اور شاید یہی وہ نیکی تھی جو اس دن، اجنبی دیس میں، ایک بوڑھی غیر مسلم عورت کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں، دعاؤں اور پھولوں کی صورت واپس لوٹ آئی۔

اللہ تعالیٰ قرآنِ کریم میں فرماتا ہے:

وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ۔(النساء:36)

اور اللہ کی بندگی کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور قریبی ہمسایہ اور اجنبی ہمسایہ اور پاس بیٹھنے والے اور مسافر اور اپنے غلاموں کے ساتھ بھی نیکی کرو۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

مَا زَالَ جِبْرِيلُ يُوصِينِي بِالْجَارِ حَتَّى ظَنَنْتُ أَنَّهُ سَيُوَرِّثُهُ(بخاری و مسلم)

جبرائیل مجھے اپنے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی تاکید کرتا رہا یہاں تک کہ میں نے سوچا کہ وہ اسے وارث بنائے گا۔

یہ آیات و احادیث ہمیں یہ سبق دیتی ہیں کہ ہمسائے کا حق مذہب، نسل اور زبان سے بالاتر ہے۔ جو شخص اللہ کے بندوں کے لیے آسانی پیدا کرتا ہے، اللہ اس کے لیے آسانیاں پیدا فرما دیتا ہے۔ ثمینہ کی زندگی اس حقیقت کی خاموش تفسیر تھی کہ اخلاص سے کی گئی نیکی، ایک دن لوٹ کر ضرور آتی ہے—کبھی دعا کی صورت میں، کبھی آنسوؤں میں، اور کبھی دلوں کی گواہی میں۔ ثمینہ کا عمل ہمیں یاد دلاتا ہے کہ اگر نیکی اللہ کے لیے ہو تو وہ کبھی ضائع نہیں جاتی، بلکہ وہیں پہنچتی ہے جہاں اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے—دلوں کی گہرائی میں، آنکھوں کی نمی میں اور اُن دعاؤں میں جو عرش تک جا پہنچتی ہیں۔

باب: رضا بالقضا — آزمائش میں سکون

کچھ بیماریاں جسم کو نہیں، روح کو آزمایا کرتی ہیں؛ اور کچھ آزمائشیں ایسی ہوتی ہیں جو انسان کے ایمان کو تولتی ہیں۔ ثمینہ کی بیماری بھی انہی آزمائشوں میں سے ایک تھی۔ اچانک آنے والا فالج محض جسمانی کمزوری نہ تھا بلکہ زندگی کے معمولات، امیدوں اور خوابوں پر ایک گہرا توقف تھا۔ مگر حیرت اس بات پر نہیں تھی کہ بیماری آ گئی، حیرت اس بات پر تھی کہ اس بیماری نے اس کے چہرے سے سکون اور دل سے شکوہ چھین نہ سکا۔

وہ بستر علالت پر بھی شاکر نظر آتی تھی۔ زبان پر شکوہ نہیں، آنکھوں میں گھبراہٹ نہیں، اور لہجے میں بے قراری نہیں تھی۔ کبھی درد شدت اختیار کرتا تو لبوں پر بس اتنا آتا: "الحمدللہ علیٰ کل حال۔" وہ جانتی تھی کہ تقدیر کے فیصلے اللہ کے علم، حکمت اور رحمت سے خالی نہیں ہوتے۔ قرآن کی یہ صدا گویا اس کے دل میں اتر چکی تھی:

وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (البقرہ:216)

مگر عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بری لگے اور وہ تمہارے حق میں بھلی ہو۔

اس کے نزدیک صبر، دانت پیس کر سہہ لینے کا نام نہیں تھا بلکہ دل کو اللہ کے فیصلے پر مطمئن کر دینے کا نام تھا۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی کہ اگر بیماری اللہ کی طرف سے آئی ہے تو اس میں بھی کوئی بھلائی ضرور پوشیدہ ہے۔ نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان اس کے یقین کا سہارا تھا

عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ... إِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ (مسلم)

مومن کا معاملہ کتنا عجب ہوتا ہے... اگر اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے اور یہی اس کے لیے بہتر ہے۔

ایسی گھڑیوں میں وہ اپنے رب کے سامنے اور زیادہ جھک جاتی، اور بیماری اس کے لیے قربِ الٰہی کا ذریعہ بن جاتی۔ اس کا صبر خاموش تھا مگر مضبوط، اور اس کی رضا بے آواز مگر گہری تھی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کو آزمائش میں بھی سکون میسر آ جاتا ہے۔

باب: عبادت، دعا اور تہجد — خاموش بندگی کی خوشبو

ثمینہ کی عبادت نمایاں نہیں تھی، مگر اثر رکھتی تھی۔ وہ عبادت کو فخر نہیں، فریضہ سمجھتی تھی؛ اور دعا کو محض الفاظ نہیں بلکہ رب سے راز و نیاز کا لمحہ مانتی تھی۔ اس کی زندگی میں نماز محض معمول نہ تھی بلکہ وقت کی ترتیب اسی کے گرد گھومتی تھی۔

تہجد اس کی روح کی غذا تھی۔ جب دنیا نیند کی آغوش میں ہوتی، وہ خاموشی سے اٹھتی، وضو کرتی، اور اپنے رب کے حضور کھڑی ہو جاتی۔ نہ لمبی دعاؤں کا اہتمام، نہ آنکھوں دکھانے والی عبادت — بس چند آنسو، چند سجدے، اور دل کی سچائی۔ قرآن میں جن بندوں کا ذکر آیا ہے، وہی کیفیت اس کے حال سے جھلکتی تھی:

تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا (السجدہ:16)

ان کے پہلو اپنے بستروں کو چھوڑ دیتے ہیں جب وہ خوف اور امید کے ساتھ اپنے رب کو پکارتے ہیں۔

اس کی دعاؤں میں دنیا کم اور آخرت زیادہ ہوتی۔ وہ اپنے لیے نہیں، دوسروں کے لیے مانگتی تھی — اولاد کے لیے، رشتے داروں کے لیے، ہمسایوں کے لیے، حتیٰ کہ ان لوگوں کے لیے بھی جنہوں نے کبھی اس کا دل دکھایا تھا۔ اسے یقین تھا کہ دعا دل کو صاف کر دیتی ہے، اور اللہ کے ہاں سب سے زیادہ وہی دعا مقبول ہوتی ہے جو کسی اور کے لیے کی جائے۔ بیماری کے دنوں میں بھی اس کی زبان دعا سے خالی نہ رہی۔ ہاتھ اٹھانے کی طاقت نہ ہوتی تو دل ہی دل میں رب کو پکار لیتی۔ اس کا یقین تھا کہ اللہ نیت کی آواز سنتا ہے، لفظوں کا محتاج نہیں۔

ثمینہ کا یہ عمل بھی ہمیں یاد دلاتا ہے کہ عبادت کا اصل حسن خاموشی میں ہے، دعا کی اصل تاثیر اخلاص میں ہے، اور تہجد کی اصل لذت اللہ سے قرب میں ہے۔ ثمینہ کی زندگی اس بات کی گواہی تھی کہ جو بندہ اللہ کے حضور جھک جاتا ہے، اللہ اسے دنیا کی سختیوں میں بھی سیدھا کھڑا رکھتا ہے۔

اختتامی دعا

اے اللہ! ہمیں بھی وہی رضا عطا فرما جو آزمائش میں شکوہ نہیں، سکون پیدا کرتی ہے؛ وہی صبر عطا فرما جو زبان نہیں، دل کو مضبوط کرتا ہے؛ اور وہی عبادت نصیب فرما جو دکھاوے سے پاک اور تیری رضا سے لبریز ہو۔

اے ربِ کریم! ثمینہ کی ہر عبادت، ہر دعا اور ہر سجدے کو اس کے حق میں نور بنا دے، اور ہمیں اس کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔ آمین یا رب العالمین۔

اے اللہ! ہم تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ تُو اس بندۂ مومنہ کی ہر چھوٹی بڑی نیکی کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما، اس کے اخلاص کو اس کے حق میں شفاعت بنا دے، اور اس کے حسنِ سلوک کو اس کے نامۂ اعمال کا روشن عنوان قرار دے۔

اے ربِ کریم! جس طرح اس نے تیرے بندوں کے دلوں سے تنہائی، دکھ اور محرومی کے بوجھ ہلکے کیے، اسی طرح تو اس کی قبر کی وحشت، برزخ کی گھبراہٹ اور آخرت کی سختیوں کو اس پر آسان فرما دے۔

اے اللہ! اس کی خطاؤں کو معاف فرما، اس کے درجات بلند فرما، اور اسے اُن نیک عورتوں کے ساتھ اٹھانا جنہوں نے تیرے دین کے لیے خاموش خدمت کو اپنا شعار بنایا۔

اے پروردگار! ہمیں بھی ایسا دل عطا فرما جو صرف تیرے لیے دھڑکے، ایسے ہاتھ دے جو بلا غرض نیکی کریں، اور ایسی زندگی نصیب فرما جس کا ہر عمل ہماری موت کے بعد بھی روشنی بانٹتا رہے۔

اے اللہ! اس تحریر کو پڑھنے والے ہر دل میں حسنِ سلوک، شفقت اور انسانیت کی محبت اتار دے، اور ہمیں اس دن سرخرو فرما جب نہ مال کام آئے گا نہ رشتے — سوائے اس دل کے جو تیرے حضور سلامت ہو۔ آمین یارب العالمین

قرآن کے ساتھ اس کا رشتہ ـــ اب تک جاری

ـــ ثمینہ کا ایک اور پہلو... وہ جو شاید سب سے خوبصورت تھا

اس کا قرآن سے تعلق۔

حدیثِ مسافر کو اس نے ایک نصیحت دی تھی:

حدیثِ مسافر کو دیا گیا اس کا مشورہ آج تک چل رہا ہے۔

جب بھی کوئی مضمون لکھیں، اس کے ساتھ متعلقہ آیت ضرور شامل کریں۔

الفاظ اڑ جاتے ہیں،

لیکن اللہ کا کلام روح میں اتر جاتا ہے۔

میں جب بھی کوئی مضمون لکھتا، وہ مسکراہٹ کے ساتھ فوراً قرآن کی وہ آیت گنوا دیتی جو اس مقام کے لئے سب سے موزوں ہوتی۔ میں جب بھی کوئی موضوع اسے بتاتا، وہ فوراً مناسب آیت تجویز کر دیتی۔

اس کی یہ خدمت..... یہ مدد..... یہی تو اس کا صدقہ جاریہ ہے جو آج بھی جاری، روشن، اور ابدی ہے۔

اس کا یہ عمل... یہ بخشش کا دروازہ..... آج بھی کھلا ہوا ہے۔

ہر آیت کے ساتھ اس کے ثواب کا ایک حصہ.....

اس کے نام لکھا جا رہا ہے۔

ـــ سچ تو یہ ہے کہ واقعات کی قطار طویل ہے

واقعات کی قطار... اور دل کی تھکن

ہر ایک اپنی باری کے لئے بے چین،

ہر ایک دل دہلا دینے والی روشنی سے بھرپور۔

لیکن قلم... شاید ابھی اتنی ہمت نہیں رکھتا

کہ سب ایک ہی نشست میں رقم ہو سکیں۔

سچ کہوں تو یہ واقعات ختم نہیں ہوتے۔

ہر ایک واقعہ اپنے اندر ایک صدی کی روشنی رکھتا ہے۔

ہزاروں یادیں،

سوچیں،

مسکراہٹیں،

آنکھوں کی نمی،

ـــ اور لفظوں میں سمٹ نہ سکنے والی محبت

سب قطار اندر قطار کھڑی ہیں۔
... لیکن دل میں اب بھی وہی لرزہ ہے
ایک ہی نشست میں سب لکھ ڈالنے کی ہمت جمع نہیں ہوتی۔
کہیں الفاظ روپڑتے ہیں
کہیں سانس ساتھ نہیں دیتا
کہیں ہاتھ کانپ جاتے ہیں۔
—اور شاید یہی محبت کی اصل شہادت ہے
جنہیں ہم یاد کرتے ہیں، وہ ہمیں ٹوٹ کر یاد آتے ہیں۔

قرآن اور موسیقی

یوں تو ثمینہ کی اُن یادوں کے سلسلے میں کئی ایسے محیر العقول واقعات اپنے وجود کی شہادت کیلئے میرا احصار کئے ہوئے ہیں لیکن ان تمام واقعات میں سے اسے تحریر کرنا اس لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ بعض واقعات کی جب وقت شہادت دیتا ہے تو اس میں مستور کئی پند و نصائح کے چشمے ابل کر قلب و قلم کے سینے سے نمودار ہو جاتے ہیں۔ اس واقعہ کی بنیاد بھی خالص قرآنی ذوق اور فہم پر استوار ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اب تک بہت کم قرآن شناس بھی اس پر لکھنے سے نجانے کیوں گریزاں ہیں:

ہم سب یہ تو مانتے اور جانتے ہیں کہ قرآن محض تلاوت کی کتاب نہیں بلکہ ہر تحریر، ہر خیال اور ہر موضوع کے آغاز میں رہنمائی کا حق رکھتا ہے۔ اسی شعور کے تحت اس نے میرے لیے آیاتِ قرآنی کے انتخاب کو محض ایک رسمی عمل نہیں رہنے دیا بلکہ اسے تحریر کی روح بنا دیا۔ یہ یادیں برسوں سے میرے دل اور قلم کے درمیان ایک خاموش مگر مضبوط رشتہ بنی ہوئی ہیں۔ یہ وہ یادیں ہیں جو اچانک ذہن کے کسی گوشے سے اُبھر آتی ہیں، اور میں فوراً انہیں لفظوں کا جامہ پہنا کر آپ کی خدمت میں سنوارنے کے لیے پیش کر دیتا ہوں۔ آج بھی ایک ایسا ہی محیر العقول واقعہ سامنے آیا تو دل نے چاہا کہ اسے اسی خوبصورت اور بامعنی پیرائے میں محفوظ کر دیا جائے جس کا ذوق ثمینہ کو قرآن فہمی کے بعد نصیب ہوا تھا۔

قرآن سے گہری وابستگی کے بعد ثمینہ پر یہ راز کھل چکا تھا کہ کلامِ الٰہی ہر موضوع، ہر احساس اور ہر مرحلۂ حیات سے براہِ راست ہم کلام ہوتا ہے۔ اسی لیے اس نے یہ معمول بنا لیا تھا کہ میرے ہر کالم، ہر مضمون اور ہر تحریر کے آغاز میں موضوع سے ہم آہنگ قرآنی آیات میرے سامنے رکھ دیتی تھی۔ یہ ایک خاموش مگر بامعنی رہنمائی تھی، جو آج بھی میرے قلم کا حصہ ہے۔ میرے قارئین کی بڑی تعداد نے اس اسلوب کو نہ صرف پسند کیا بلکہ بارہا اس سے استفادے کا اعتراف بھی کیا۔ یوں ثمینہ کے ہاتھوں شروع ہونے والا یہ صدقۂ جاریہ آج تک جاری و ساری ہے۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی کی کتاب "محاضرات قرآنی" کے صفحہ 148 پر درج اس اقتباس نے مجھ پر حیرت کے کئی در وا کر دیئے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں: آپ نے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا نام سنا ہو گا، انہوں نے غالباً 1958ء میں خود براہ راست مجھ سے یہ واقعہ بیان کیا تھا کہ غالباً 1958-1957ء میں ایک شخص ان کے پاس آیا۔ ان کی زندگی کا یہ ایک عام معمول تھا کہ ہر روز دو چار لوگ ان کے پاس آتے اور اسلام قبول کرتے تھے۔ وہ بھی ایسا ہی ایک دن تھا کہ ایک صاحب آئے اور کہا کہ میں اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے حسب عادت ان کو کلمہ پڑھوایا اور اسلام کا مختصر تعارف ان کے سامنے پیش کر دیا۔ اپنی بعض کتابیں انہیں دے دیں۔

ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ ان کا معمول تھا کہ جب بھی کوئی شخص ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کرتا تھا تو وہ اس سے یہ ضرور پوچھا کرتے تھے کہ اسے اسلام کی کس چیز نے متاثر کیا ہے؟ 1948ء سے 1996ء تک یہ معمول رہا کہ ڈاکٹر صاحب کے دست مبارک پر اوسطاً دو افراد روزانہ اسلام قبول کیا کرتے تھے۔ عموماً لوگ اسلام کے بارے میں اپنے جو تاثرات بیان کیا کرتے تھے، وہ ملتے جلتے ہوتے تھے۔ ان میں نسبتاً زیادہ اہم اور نئی باتوں کو ڈاکٹر صاحب اپنے پاس قلم بند کر لیا کرتے تھے۔ اس شخص نے جو بات بتائی، وہ ڈاکٹر صاحب کے بقول بڑی عجیب و غریب اور منفرد نوعیت کی چیز تھی اور میرے لیے بھی بے حد حیرت انگیز تھی۔

اس نے جو کچھ کہا، اس کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا ارشاد تھا کہ میں اسے بالکل نہیں سمجھا اور میں اس کے بارے میں کوئی کلی رائے نہیں دے سکتا۔

اس شخص نے بتایا: میرا نام ژاک ژیلبیر ہے۔ میں فرانسیسی بولنے والی دنیا کا سب سے بڑا موسیقار ہوں۔ میرے بنائے اور گائے ہوئے گانے فرانسیسی زبان بولنے والی دنیا میں بہت مقبول ہیں۔ آج سے چند روز قبل مجھے ایک عرب سفیر کے ہاں کھانے کی دعوت میں جانے کا موقع ملا۔ جب میں وہاں پہنچا تو وہاں سب لوگ جمع ہو چکے تھے اور نہایت خاموشی سے ایک خاص انداز کی موسیقی سن رہے تھے۔ جب میں نے وہ موسیقی سنی تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے یہ موسیقی کی دنیا کی کوئی بہت ہی اونچی چیز ہے، جو یہ لوگ سن رہے ہیں۔ میں نے خود آوازوں کی جو دھنیں اور ان کا جو نشیب و فراز ایجاد کیا ہے، یہ موسیقی اس سے بھی بہت آگے ہے بلکہ موسیقی کی اس سطح تک پہنچنے کیلئے ابھی دنیا کو بہت وقت درکار ہے۔

میں حیران تھا کہ آخر یہ کس شخص کی ایجاد کردہ موسیقی ہو سکتی ہے اور اس کی دھنیں آخر کس نے ترتیب دی ہیں۔ جب میں نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ یہ دھنیں کس نے بنائی ہیں تو لوگوں نے مجھے اشارہ سے خاموش کر دیا لیکن تھوڑی دیر بعد پھر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے پھر یہی بات پوچھی لیکن وہاں موجود حاضرین نے مجھے خاموش کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ اس گفتگو کے دوران وہ فن موسیقی کی کچھ اصطلاحات بھی استعمال کر رہا تھا، جن سے میں واقف نہیں، کیونکہ فن موسیقی میرا میدان نہیں۔

قصہ مختصر جب وہ موسیقی ختم ہو گئی اور وہ آواز بند ہو گئی تو پھر اس نے بڑی بے تابی اور مضطرب انداز میں لوگوں سے پوچھا کہ یہ سب کیا تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ موسیقی نہیں تھی بلکہ قرآن مجید کی تلاوت ہے اور فلاں قاری کی تلاوت ہے۔ موسیقار نے کہا کہ یقیناً یہ کسی قاری کی تلاوت ہو گی اور یہ قرآن ہو گا، مگر اس کی یہ موسیقی کس نے ترتیب دی ہے اور یہ دھنیں کس کی بنائی ہوئی ہیں؟ وہاں موجود مسلمان حاضرین نے بیک زبان وضاحت کی کہ نہ یہ دھنیں کسی کی بنائی ہوئی ہیں اور نہ ہی یہ قاری موسیقی کی ابجد سے واقف ہیں۔ اس موسیقار نے جواب میں کہا کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ دھنیں کسی کی بنائی ہوئی نہ ہوں لیکن اسے یقین دلایا گیا کہ قرآن مجید کا کسی دھن سے یا فن موسیقی سے کبھی کوئی تعلق ہی نہیں رہا۔ یہ فن تجوید ہے اور ایک بالکل الگ چیز ہے۔

اس نے پھر یہ پوچھا کہ اچھا مجھے یہ بتاؤ کہ تجوید اور قرأت کا یہ فن کب ایجاد ہوا؟ اس پر لوگوں نے بتایا کہ یہ فن تو 14 صدیوں سے زائد سے چلا آ رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب لوگوں کو قرآن مجید عطا فرمایا تو فن تجوید کے اصولوں کے ساتھ ہی عطا فرمایا تھا۔ اس پر اس موسیقار نے کہا کہ اگر محمد ﷺ نے اپنے لوگوں کو قرآن مجید اسی طرح سکھایا ہے جیسا کہ میں نے ابھی سنا ہے تو پھر بلاشبہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اس لیے کہ فن موسیقی کے جو قواعد اور ضوابط اس طرز قرأت میں نظر آتے ہیں، وہ اتنے اعلیٰ وارفع ہیں کہ دنیا ابھی وہاں تک نہیں پہنچی۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب اس کی یہ بات سمجھنے سے قاصر تھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس شخص نے کہا کہ بعد میں، میں نے اور بھی قرأ کی تلاوت قرآن کو سنا، مسجد میں جا کر سنا اور مختلف لوگوں سے پڑھوا کر سنا اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اور اگر یہ اللہ کی کتاب ہے تو اس کے لانے والے یقیناً اللہ کے رسول ﷺ تھے، اس لیے آپ مجھے مسلمان کر لیں۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ میں نے اسے کلمہ شہادت پڑھوا کر مسلمان کر لیا لیکن میں نہیں جانتا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا وہ کس حد تک درست تھا، اس لیے کہ میں اس فن کا آدمی نہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ میں نے ایک الجزائری مسلمان کو جو پیرس میں زیر تعلیم تھا، اس نئے موسیقار مسلمان کے بے حد اصرار پر اس کی دینی تعلیم کیلئے مقرر کر دیا۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد وہ دونوں میرے پاس آئے اور کچھ پریشان سے معلوم ہوتے تھے۔ الجزائری معلم نے مجھے بتایا کہ وہ نو مسلم قرآن مجید کے بارے میں کچھ ایسے شکوک کا اظہار کر رہا ہے جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ جس بنیاد پر یہ شخص ایمان

لایا تھا، وہ بھی میری سمجھ میں نہیں آئی تھی اب اس کے شکوک کا میں کیا جواب دوں گا اور کیسے دوں گا؟ لیکن اللہ کا نام لے کر پوچھا کہ بتاؤ تمہیں کیا شک ہے؟

اس نو مسلم نے کہا کہ آپ نے مجھے یہ بتایا تھا اور کتابوں میں بھی، میں نے پڑھا ہے کہ قرآن مجید بعینہ اسی شکل میں آج موجود ہے جس شکل میں اس کے لانے والے پیغمبر ﷺ نے اسے صحابہ کرام کے سپرد کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ واقعی ایسا ہی ہے۔ اب اس نے کہا کہ ان صاحب نے مجھے اب تک جتنا قرآن پڑھایا ہے، اس میں ایک جگہ کے بارے میں مجھے لگتا ہے کہ اس میں کوئی نہ کوئی چیز ضرور حذف ہو گئی ہے۔ اس نے بتایا کہ انہوں نے مجھے سورۂ نصر پڑھائی ہے اور اس میں ''اَفۡوَاجًا'' اور '' فَسَبِّحۡ'' کے درمیان خلا ہے۔ جس طرح انہوں نے مجھے پڑھایا ہے، وہاں اَفۡوَاجًا پر وقف کیا ہے۔ وقف کرنے سے وہاں سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے جو نہیں ٹوٹنا چاہیے جبکہ میرا فن اور برسوں کا تجربہ کہتا ہے کہ یہاں خلا نہیں ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے کہ یہ سن کر میرے پیروں تلے زمیں نکل گئی، اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس شبہ کا جواب کیا دیں اور کس طرح مطمئن کریں ۔ کہتے ہیں کہ میں نے فوراً دنیائے اسلام پر نگاہ دوڑائی تو کوئی ایک فرد بھی ایسا نظر نہیں آیا جو فن موسیقی سے بھی واقفیت رکھتا ہو اور تجوید بھی جانتا ہو۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ چند سیکنڈ کی شش و پنج کے بعد بالکل اچانک اور یکایک میرے ذہن میں ایک پرانی بات اللہ تعالیٰ نے ڈالی کہ اپنے بچپن میں جب مکتب میں قرآن مجید پڑھا کرتا تھا تو میرے معلم نے مجھے بتایا تھا کہ '' اَفۡوَاجًا'' پر وقف نہیں کرنا چاہیے بلکہ اَفۡوَاجًا کو بعد کے لفظ سے ملا کر پڑھا جائے۔ ایک مرتبہ میں نے '' اَفۡوَاجًا'' پر وقف کیا تھا تو اس پر انہوں نے مجھے سزا دی تھی اور سختی سے تاکید کی تھی کہ اَفۡوَاجًا کو آگے فَسَبِّحۡ'' سے ملا کر پڑھا کریں۔

میں نے سوچا کہ شاید اس بات سے اس کا شبہ دور ہو جائے اور اس کو اطمینان ہو جائے۔ میں نے اسے بتایا کہ آپ کے جو پڑھانے والے ہیں، وہ تجوید کے اتنے ماہر نہیں ہیں۔ دراصل یہاں اس لفظ کو غنہ کے ساتھ آگے سے ملا کر پڑھا جائے گا۔ ''افواجاً فسبح''۔ ڈاکٹر صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ وہ خوشی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا اور مجھے گود میں لے کر کمرے میں ناچنے لگا اور کہنے لگا کہ واقعی ایسے ہی ہونا چاہیے۔ یہ سن کر اس کو میں نے ایک دوسرے قاری کے سپرد کر دیا جس نے اس شخص کو پورے قرآن پاک کی تعلیم دی۔ وہ وقتاً فوقتاً مجھ سے ملتا تھا اور بہت سر دھنتا تھا کہ واقعی یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔ وہ بہت اچھا مسلمان ثابت ہوا اور ایک کامیاب اسلامی زندگی گزارنے کے بعد 1970ء کے لگ بھگ اس کا انتقال ہو گیا۔ اس واقعے سے مجھے خیال ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی جو صوتیات ہے، یہ علم و فن کی ایک ایسی دنیا ہے جس میں کوئی محقق آج تک نہیں اترا ہے اور نہ ہی قرآن مجید کے اس پہلو پر اب تک کسی نے اس انداز سے غور و خوض کیا ہے۔

مجھے یہ واقعہ 12 برس پیچھے لے گیا جب ثمینہ کا پورا جسم فالج کی وجہ سے شدید متاثر اور معذور ہو گیا۔ اس اچانک افتاد نے دنیا اندھیر کر دی اور بالآخر ان کے علاج اور تشخیص کیلئے اہلیہ کے تمام ٹیسٹ پر ڈاکٹروں کا ایک پورا بورڈ میسر آ گیا، خوش قسمتی سے دنیا کے سب سے بڑے معالج "پروفیسر بیکر" کی خدمات حاصل ہو گئیں۔ کانفرنس روم میں موت جیسا سناٹا چھایا ہوا تھا کہ نجانے کیا اعلان ہو۔ تمام متعلقہ ٹیسٹ کے بعد ڈاکٹر بیکر نے اپنی نیلی آنکھوں پر سے چشمہ ہٹاتے ہوئے میرے چہرے پر نظریں گاڑ دیں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میرا دل حلق کے اندر آ گیا ہے۔ پروفیسر نے پہلے تمام ٹیسٹ کے نتائج کے بارے میں آگاہ کیا اور آخر میں انتہائی افسوس کے ساتھ بتایا کہ مریضہ کے پاس صرف دو ہفتے ہیں لیکن مجھے اس بات پر بڑی حیرت ہو رہی ہے کہ مریضہ کے دماغ سے یہ حملہ ہوا جس نے ان کے سارے جسم کو مفلوج کر دیا لیکن ان کا چہرہ، گلا، ناک، آنکھیں اور کان اس حملے سے کیسے بچ گئے

اور یہ تمام اعضاء مکمل طور پر صحت مند ہیں جبکہ یہ میڈیکل سائنس اور ہمارے تجربے کی نفی ہے؟

پروفیسر بیکر کے اس اعلان پر میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا اور دل کی دھڑکن اس قدر تیز ہو گئی تھی کہ میں ہکا بکا اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا کہ ممکن ہے کہ یہ کوئی اچھی خبر سنا دے۔ میں نے پروفیسر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں ڈاکٹروں کے پورے بورڈ کے تجربات کو جھٹلانے کی ہمت تو نہیں کر سکتا لیکن اہلیہ کے چہرے کے بارے میں جو رائے دی گئی ہے، اس کی بابت یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جس رب کی طرف سے یہ آزمائش آئی ہے، میں نے اپنی ساری ازدواجی زندگی میں اہلیہ کو قرآن کا عاشق پایا ہے اور عین ممکن ہے کہ میرے کریم رب نے اس قرآن پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کے طفیل ان کے چہرے کو مکمل محفوظ رکھا ہو۔ یہ کہہ کر میں کھڑا ہو گیا۔ فوری طور پر پروفیسر نے میرے دونوں کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ جماتے ہوئے مجھے بڑے خوبصورت انداز میں یہ نصیحت کی کہ "ہم ڈاکٹر صرف اپنے تجربات کی بناء پر اپنی آراء قائم کرتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ بالکل ویسا ہی ہو، تاہم میں آپ کی اس بات سے مکمل طور پر اتفاق کرتا ہوں کہ ہمیں ان معجزات پر بھی یقین کرنا ہو گا جو ہمیں کبھی کبھار دیکھنے کو ملتے ہیں جس سے انکار کرنا اس لئے ممکن نہیں ہوتا کہ وقت ہمیں اس کی شہادت دینے پر مجبور کر دیتا ہے۔

ثمینہ اس واقعے کے بعد چھ سال تک زندہ رہیں لیکن اپنی معذوری کی اور شدید علالت کی بناء پر انہیں نرسنگ ہوم میں منتقل کرنا پڑ گیا۔ وہ اس حال میں بھی ہر وقت قرآن و تسبیحات میں مشغول رہتی تھیں۔ معجزاتی طور پر ان کے جسم کا دایاں حصہ حرکت کرنے لگا اور امید بندھ گئی اور پروفیسر بیکر بھی اس تبدیلی پر بڑا حیران تھا۔ ایک دن پروفیسر ثمینہ کی تیمارداری کیلئے جب آیا تو ہم سب حسب معمول قاری عبدالباسط مرحوم کی آواز میں "سورہ الرحمٰن" کی تلاوت سن رہے تھے۔ میں لیپ ٹاپ پر آواز کو جب کم کرنے لگا تو اس نے مجھے منع کر دیا اور خود بھی بڑے انہماک کے ساتھ سننا شروع کر دیا۔ میں اس کے چہرے کے تغیرات کو بغور دیکھ رہا تھا۔ سورہ مکمل ہونے پر اس نے مجھ سے اس بارے میں دریافت کیا تو اس نے بے ساختہ کہا کہ میرا جی چاہتا تھا کہ یہ آواز جاری و ساری رہے اور کبھی ختم نہ ہو جبکہ میں اس کے مفہوم و معنی سے بالکل نابلد ہوں لیکن یہ آواز براہِ راست میرے دل پر اثر کر رہی تھی۔

ہمارا یہ معمول تھا کہ دن کا زیادہ وقت سورہ رحمٰن سنتے رہتے تھے لیکن اس دن مجھے بہت تعجب ہوا جب نرسنگ ہوم کے انگریز ڈائریکٹر "سائمن" نے مجھ سے اس سورہ کے بارے میں درخواست کی کہ میں اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اسے اونچی آواز میں لگا دیا کروں کہ باقی مریض بھی اس سے استفادہ کریں کہ مریضوں کی اکثریت دروازے کے باہر کھڑی بڑی خاموشی کے ساتھ سن کر بڑا سکون محسوس کرتے ہیں۔ انہی مریضوں میں ایک 91 سالہ "ارنسٹ ٹو ملیسن" بھی تھا جو کینسر کا مریض تھا اور انتہائی کرب کے ساتھ سارا دن چیختا اور تڑپتا رہتا تھا۔ اس کو اس کرب سے نجات دلانے کیلئے روزانہ انجیکشن دیکر سلا دیا جاتا تھا۔ ایک دن اس نے جب سورہ رحمٰن کو سنا تو اس نے بے اختیار نرس کو اس آواز کے تعاقب کیلئے بھیجا۔ معلوم ہونے پر اس نے ہمارے کمرے میں آنے کی درخواست کی۔

حیرت انگیز طور پر وہ انتہائی خاموشی کے ساتھ اس کو سنتا رہا اور اس نے بڑی عاجزی کے ساتھ درخواست کی کہ مجھے ہر روز اس کو سننے کیلئے کمرے میں آنے کی اجازت دی جائے جبکہ میں نے اسی کے کمرے میں اس کا بندوبست کر دیا۔ مجھے میڈیکل سٹاف کے اس انکشاف نے مزید حیران کر دیا کہ جب سے اس نے سورہ رحمٰن کو سننا شروع کیا ہے، اس کے انجیکشن کو ہم نے بتدریج ختم کر دیا ہے کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ معاملہ ایسا بڑھا کہ نرسنگ ہوم میں باقاعدہ طور پر ہر روز دو گھنٹے کیلئے سورہ رحمٰن کی تلاوت کا اہتمام کر دیا گیا۔ ثمینہ تو رمضان کی 27 ویں مبارک شب کو اللہ کے پاس چلی

گئیں مگر بعد ازاں مجھے بتایا گیا کہ "ارنسٹ" برطانیہ کا ایک مشہور میوزیشن رہا ہے اور اس کی تیار کردہ سینکڑوں دھنیں پوری دنیا میں بہت مشہور ہیں۔

میں نہیں جانتا کہ اس سارے واقعہ کی منطقی وجوہات کیا ہیں لیکن اس واقعہ کو پڑھنے کے بعد مجھ پر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ گئے ہیں کہ ہم نے آخر تحقیق سے کیوں منہ موڑ رکھا ہے کہ اغیار کی گواہیاں علی اعلان سامنے آرہی ہیں۔ امریکا کی ریسرچ یونیورسٹیوں کے حالیہ جائزہ رپورٹ میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ دیندار حضرات میں شرح بیماری کم ہے اور ان کے اندر قوتِ دفاع دوسروں کے بالمقابل زیادہ ہے، ہائی بلڈ پریشر کا شکار عمومی طور پر 65 سال کی عمر والے حضرات ہوتے ہیں لیکن دیندار حضرات میں یہ تناسب 40 فیصد کم ہے۔ واضح رہے کہ بلڈ پریشر عمومی طور پر دل و دماغ پر اثر انداز ہوتا ہے اور ان حالات میں دماغی رگوں کے پھٹنے کا امکان زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ عالمی شہرت یافتہ ڈاکٹر ہارولڈ کہتا ہے: "ہمیں پورا یقین ہے کہ اسلام میں نماز اور دیگر شعائر کی ادائیگی کا حکم ایک مثبت اور درست حکم ہے جس کے بہتر اور صحت افزا اثرات انسانی جسم پر نمودار ہوتے ہیں اور عام لوگوں کے مقابلہ میں دیندار حضرات بیماریوں کا کم شکار ہوتے ہیں"۔

اس تحقیقی رپورٹ کی اہمیت یوں بھی بڑھ جاتی ہے کہ امریکی یونیورسٹیوں کی خالص علمی و تحقیقی ریسرچ کمپنیوں نے اس کا انکشاف کیا ہے اور ایسے معاشرہ میں یہ بات سامنے آئی ہے جو خالص مادی ہے، جو محسوسات سے ماوراء چیزوں کو نہیں دیکھتا، پھر ایسے ماہرین و محققین نے اعتراف کیا ہے جو خالص عالمی بنیادوں کو اپنا معیار بناتے ہیں، اور پھر ایسے زمانے میں جبکہ مادیت کا ہر طرف غلبہ ہے اور لوگ روحانی افلاس کا شکار ہیں۔

زمانہ قدیم سے طب اور علاج مذہب اور دین سے جڑے ہیں لیکن امراض سے شفا حاصل کرتے پنڈتوں اور کاہنوں کے پاس جاتے اور وہ روحانی پیشوا کچھ خاص طریقوں سے ان کا علاج کرتے اور یہ طریقہ بابل، کلادن، اور آشوریوں کے یہاں رائج تھا۔ مصر اور ہندوستان میں زمانہ قدیم ہی سے تعویذ اور گنڈوں کا استعمال عام تھا۔ یونانیوں کے یہاں علم طلب دیندار طبقہ کے ساتھ خاص تھا، مریض عبادت گاہوں کا چکر لگاتے، کاہنوں کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ بحالت خواب مرض و علاج کی تشخیص کرتے ہیں۔

ماضی کا انسان امراض اور اسباب علاج کو دین و مذہب سے جوڑے ہوتا تھا لیکن آج مغربی و مادی تہذیب میں گھل مل کر انسان اس سے بالکل غافل ہو چکا ہے اور بے شمار لاعلاج امراض کا شکار ہو کر بھی دین و اخلاق اور اعلیٰ اقدار سے کوسوں دور ہے، یہی وجہ ہے کہ انسان بے شمار جسمانی اور نفسیاتی امراض کا شکار ہو گیا ہے۔ یہ بیماریاں ان معاشروں میں بکثرت ہیں جو مادیت میں غرق اور فضائل و اخلاق سے بہت دور ہیں۔ آج خطرناک ترین بیماریوں کے گراف بڑھتے جارہے ہیں، ایڈز، منشیات کی بری عادت، دل کی بیماریوں، دورے اور شوگر جیسی مہلک بیماریاں عام ہو رہی ہیں۔ ایک جائزہ کے مطابق 13 فیصد امریکی عوام نفسیاتی امراض میں مبتلا ہیں، 85 فیصد لوگ ذہنی و دماغی الجھنوں کا شکار ہیں، شفاخانوں میں 50 فیصد سیٹیں ایسے مریضوں کیلئے خاص ہیں جو ذہنی و دماغی امراض میں مبتلا ہیں۔

گزشتہ ادیان کے ماننے والے علاج و معالجہ کا رشتہ مذہب و دین سے جوڑے ہوئے تھے جبکہ مذاہب انسانوں کے خود ساختہ تھے۔ آسمانی مذاہب اس کے زیادہ اہل ہیں کہ دوا علاج کو مذہب سے جوڑیں، دین اسلام جو ہر طرح کی تحریف و تاویل سے پاک و مبرا ہے، اس پر یہ ذمہ داری مزید عائد ہوتی ہے جبکہ سورۂ حجر کی آیت 9 میں ارشاد ہے: " إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ بے شک یہ کتاب نصیحت ہم ہی نے اتاری اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں"۔ مذہب اسلام پوری انسانیت کیلئے ہدایت و رحمت کا دین ہے، ایک کامل و مکمل نمونہ حیات ہے، انسان کی زندگی کو راحت بخشنے والا مصائب و آلام سے چھٹکارا دلانے والا دین ہے، دنیا و آخرت کی فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔ قرآن و حدیث میں امراض اور ان کے اسباب و علاج مذکور

ہیں لیکن وائے افسوس کہ ہم نے قرآن کے مطالعہ اور تحقیق سے منہ موڑ رکھا ہے۔ اس پوری داستان، ذاتی مشاہدات اور بیان کردہ واقعات کا حاصل جب ایک جگہ جمع کیا جائے تو یہ محض یادوں کا بیان نہیں رہتا بلکہ ایک واضح فکری و تجرباتی رپورٹ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

میں مڑ کر دیکھتا ہوں تو یہ حقیقت ایک واضح رپورٹ کی صورت میں میرے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے کہ ثمینہ نے یہ راز بہت پہلے قرآن فہمی کے ذریعے پالیا تھا۔ اس کے نزدیک قرآنی آیت کا انتخاب کسی تحریر کی زینت یا رسمی تبرک نہیں تھا بلکہ وہ اسے موضوع، نیت اور پیغام کے باہمی ربط کا ذریعہ سمجھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آیتِ قرآنی تحریر کے آغاز میں محض اقتباس نہیں بنتی تھی بلکہ قاری کے ذہن و قلوب کو ایک روشن راستہ کی طرف راغب کرتی تھیں۔ اسی فہم کے باعث اس کی منتخب کردہ آیات نہ صرف تحریر کے آغاز کو معنی عطا کرتی تھیں بلکہ قاری کے ذہن کو بھی ایک خاص فکری سمت میں یقین کی حد تک منظم کر دیتی تھیں۔ یہی قرآنی ذوق بعد ازاں ان مشاہدات اور تجربات سے جڑتا چلا گیا جن میں قرآن کی صوتیات، اس کا آہنگ اور اس کی روح انسانی دل و دماغ اور حتیٰ کہ جسمانی کیفیات پر اثر انداز ہوتی نظر آئیں۔

ان مشاہدات سے یہ نکتہ بھی واضح ہوتا ہے کہ قرآن کی صوتیات، اس کا آہنگ اور اس کی تلاوت محض جمالیاتی تجربہ نہیں بلکہ انسانی دل، اعصاب اور کیفیاتِ جسمانی پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہؒ کے بیان کردہ واقعے میں ایک عالمی شہرت یافتہ موسیقار کا قرآن کی صوتی ساخت سے متاثر ہو کر ایمان لانا، اور پھر سورۂ نصر میں وقف و وصل کے ایک نکتے پر اس کا حساس ردعمل، اس بات کی شہادت ہے کہ قرآن کا صوتی نظام انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہے۔

اسی طرح ثمینہ کی طویل علالت، ان کے چہرے کا محفوظ رہنا، اور سورۂ رحمٰن کی تلاوت کے نتیجے میں نہ صرف ان کی اپنی کیفیت میں سکون بلکہ نرسنگ ہوم کے دیگر مریضوں، حتیٰ کہ ایک شدید تکلیف میں مبتلا موسیقار مریض کے درد میں نمایاں کمی، اس امر کی عملی مثالیں ہیں کہ قرآن کو شفا اور رحمت کے طور پر سمجھنا محض نظری دعویٰ نہیں۔ یہ اثرات ایسے افراد پر بھی ظاہر ہوئے جو نہ قرآن کے مفہوم سے واقف تھے اور نہ ہی مذہبی پس منظر رکھتے تھے۔

ان تمام نتائج و مشاہدات کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ثمینہ کے انتخابِ آیات کا سلسلہ محض ایک ذاتی یا شخصی عادت نہیں بلکہ ایک زندہ عملی شہادت تھا کہ قرآن ہدایت کے ساتھ ساتھ شفا، سکون اور توازنِ حیات کا سرچشمہ ہے۔ آج بھی میری تحریروں میں شامل قرآنی حوالے اسی فکری وراثت کا تسلسل ہیں، اور الحمدللہ یہ صدقۂ جاریہ اب بھی جاری و ساری ہے۔

آج میں نے آپ کے سامنے کوئی محض ذاتی یادداشت یا جذباتی واقعہ بیان نہیں کیا، بلکہ ایک ایسے مشاہداتی تجربے کا ذکر کیا ہے جو قرآنِ مجید کی صوتیات، اس کے آہنگ اور انسانی فطرت پر اس کے اثرات کو ایک نئے زاویے سے ہمارے سامنے رکھتا ہے۔ یہ گفتگو ایک فرد یا ایک خاندان تک محدود نہیں بلکہ ایک عالمگیر حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

یہ بات سمجھنے کی ہے کہ قرآن محض پڑھنے یا سننے کی کتاب نہیں، بلکہ ایک زندہ کلام ہے۔ یہی شعور ثمینہ کو حاصل ہو چکا تھا۔ وہ میری ہر تحریر کے آغاز میں قرآنی آیت کا انتخاب محض برکت کے لیے نہیں کرتی تھیں، بلکہ اس لیے کہ آیت موضوع، نیت اور پیغام کو ایک فکری وحدت میں پرو دے۔ یہ منہج ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ قرآن ہماری سوچ کو ابتدا ہی میں ایک درست سمت عطا کرتا ہے۔

اسی تسلسل میں ایک نہایت اہم اور حالیہ واقعہ بھی اس مضمون میں شامل کیے بغیر بات مکمل نہیں ہوتی۔ حالیہ عالمی اقبال کانفرنس، کوئٹہ کی تین روزہ عظیم الشان نشستوں کے دوران، جب مسلسل علمی و فکری مباحث کے باعث شرکاء اور سامعین پر تھکن کے آثار نمایاں ہونے لگے، تو کانفرنس کے روحِ رواں نے نہایت دانشمندانہ انداز میں اس کانفرنس کی آخری نشست کو ایک روحانی مجلس میں تبدیل کر کے فضا کو یکسر بدل دیا۔ حافظ طاہر صاحب نے اس نشست کو عالمی قراء کانفرنس کی صورت میں قرآنِ کریم کی پر سوز اور دل میں اتر جانے والی آوازوں سے سجا دیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہال میں بیٹھے تمام سامعین پر یکایک ایک وجدانی سکوت طاری ہو گیا ہے۔ خود مجھ پر اس لمحے ایسا اثر ہوا کہ دل نے گواہی دی، جیسے ثمینہ بھی کہیں اسی روحانی مجلس میں شریک ہو کر اس نورانی فضا سے مستفیذ ہو رہی ہو۔

اختتامی کلمہ اور تحقیقی خلاصہ

مندرجہ بالا نتائج و مشاہدات کو اگر قدرے علمی زاویے سے دیکھا جائے تو یہ تحریر محض ایک شخصی بیانیہ نہیں رہتی بلکہ ایک تجرباتی ثبوت اور کوالٹیٹو آبزرویشن کی ایک ابتدائی صورت بن جاتی ہے۔ قرآنِ مجید کی صوتیات، آہنگِ تلاوت اور فنِ تجوید کے اثرات یہاں صرف روحانی تسکین تک محدود نہیں رہتے بلکہ نفسیاتی سکون، اعصابی توازن اور جسمانی کیفیات پر مثبت اثرات کے شواہد بھی فراہم کرتے ہیں۔ مختلف پس منظر رکھنے والے افراد — خواہ وہ عالمی شہرت یافتہ موسیقار ہوں یا شدید جسمانی اذیت میں مبتلا مریض — ان اثرات کا یکساں طور پر محسوس کرنا اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ قرآن کی تاثیر ایک یونیورسل فینومینن رکھتی ہے جو زبان، ثقافت اور عقیدے کی حد بندیوں سے ماورا ہے۔

یہ مشاہدات اس ضرورت کو مزید واضح کرتے ہیں کہ قرآن کے اس پہلو پر باقاعدہ بین الاقوامی اور بین العلومی تحقیق کی جائے جس میں صوتیات، نفسیات، اعصابی سائنس اور روحانیات کو یکجا کر کے مطالعہ کیا جائے۔ ثمینہ کا انتخابِ آیات کا منہج، اس تحقیقی خلا کی طرف ایک عملی اشارہ تھا — ایک ایسا منہج جو تحریر، فکر اور زندگی تینوں کو قرآن کے نور سے مربوط کرتا ہے۔ یوں یہ تحریر ایک ذاتی یادداشت سے آگے بڑھ کر اس دعوت پر ختم ہوتی ہے کہ قرآن کو محض مطالعہ نہیں بلکہ زندہ متن کے طور پر سمجھا اور برتا جائے، کہ اسی میں انسان کی فکری، روحانی اور جسمانی فلاح مضمر ہے۔

یہ تمام مشاہدات ہم سے یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا ہم نے قرآن کو صرف ثواب کی کتاب سمجھ کر محدود نہیں کر دیا؟ کیا وقت نہیں آ گیا کہ ہم قرآن کی صوتیات، اس کے نفسیاتی اور اعصابی اثرات پر سنجیدہ، بین العلومی تحقیق کریں؟ یہی وہ دعوت ہے جو اس تحریر کے نتائج و مشاہدات ہمیں دیتے ہیں۔

آخر میں، میں یہی عرض کروں گا کہ قرآن کو محض مطالعے کی چیز نہ سمجھا جائے بلکہ اسے ایک زندہ رہنمائی، ایک شفا اور ایک فکری نور کے طور پر اپنی زندگیوں میں داخل کیا جائے۔ ثمینہ کا انتخابِ آیات کا منہج ہمیں یہی سبق دیتا ہے کہ جب قرآن زندگی کے آغاز میں آ جائے تو انجام خود بخود سنور جاتا ہے۔ اللہ ہمیں قرآن کو سمجھنے، سننے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

فالج کی زنجیریں۔۔۔صبر اور آزمائش

دن بدل گئے، لیکن مسافرِ حدیث اور ثمینہ سمیع کی زندگی کے رنگ وہی روشن نہیں رہے تھے۔
دنیا کی سختیاں اور ریاستی جبر،
تحریروں کے خوف، اور علم کی راہ میں رکاوٹیں،
ان کے دروازے پر دستک دینے لگیں۔
مسافرِ حدیث کی قلم سے نکلنے والے الفاظ
جو ظلم، ناانصافی، اور مظالم کے خلاف چیختے تھے،
اب استعمار کے لیے بھی ایک بوجھ بن گئے تھے۔

بھلا استعمار کب تک اس سچ کے حروف پر مبنی تحریروں کو برداشت کرتا، بالآخر وہ گھڑی آن پہنچی کہ میرے قلم سے نکلی ہوئی تحریریں میرے ضمیر اور وجود کے امتحان کیلئے اعلان جنگ کرکے میرے سامنے آن کھڑی ہوئیں۔ میرے قلم نے حمیتِ ابوبکرؓ، شجاعتِ عمرؓ، حلمِ عثمانؓ، عدلِ علیؓ، غیرتِ حسینؓ اور امام احمد بن حنبلؒ کو اپنے آئیڈیل کے طور پر دل و جان میں سمار کھا تھا، گویا اب قرآن کی وہ آیت سامنے آگئی کہ یٰۤاَیُّہَاالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لِمَ تَقُوۡلُوۡنَ مَالَاتَفۡعَلُوۡنَ۔۔۔اے لوگو جو ایمان لائے ہو! کیوں کہتے ہو جو تم نہیں کرتے۔

3 دسمبر کی وہ انتہائی سرد صبح، نقطہ انجماد سے بھی نیچے، مسجد سے نماز فجر کے بعد ابھی لوٹا ہی تھا کہ دروازے کی دستک پر جونہی اسے کھولا تو عقدہ کھلا کہ استعمار قانونی طور پر پوری تیاری کے ساتھ حملہ آور ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے۔
ایک لمبی داستان، اس پر پھر کبھی بات ہوگی تاہم مختصر کہ استعمار اپنی پوری تیاریوں اور کوششوں کے باوجود بری طرح ناکام تو ہو گیا، بظاہر ملک کے مشہور اخبارات کے آدھے صفحوں کی زینت بننے والی پر اسرار کہانیاں بھی دم توڑ گئیں اور آزادی صحافت کا نعرہ بلند کرنے والے میڈیا کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ اپنے ہی ملک کی سب سے بڑی عدالت سے ثابت بے گناہی کی خبر کو اپنے ہاں کوئی جگہ دیتے لیکن اسی دوران میں اس مبینہ سازش کی قیمت ادا کر چکا تھا کہ ثمینہ یہ ذہنی بوجھ برداشت نہ کر پائی۔

ثمینہ سمیع۔۔۔صبر کی مثال

ثمینہ، جو ہمیشہ خدمت اور عبادت میں سرشار رہی،
اب اپنے شوہر کے خوف اور جبر کے بوجھ کو برداشت کر رہی تھی۔
چھ سال دو ماہ سترہ دن......
لمحات، جو ہر دن کی طرح ایک مستقل امتحان بن گئے۔
فالج کی زنجیریں اس کے جسم پر چھا گئیں، لیکن روح میں وہ روشنی برقرار رہی۔
وہ معجزاتی طور پر نہ صرف بول سکتی تھی بلکہ تلاوتِ قرآن میں اس کا انہماک حد درجہ بڑھ گیا، پہلے ہی دن ملک کے سب سے نامور ڈاکٹر پروفیسر بیکر نے یہ کہہ کر امید کے سارے چراغ گل کر دیئے کہ زندگی کی یہ گاڑی اب شائد دو ہفتوں سے زائد نہ چل پائے۔ اس کی آنکھوں میں ہر لمحہ دعا کی جھلک تھی۔ ہر سانس میں صبر کی خوشبو تھی، اور ہر جنبش میں عشقِ رسول ﷺ کی سرشاری۔

حدیثِ صبر — آخری مکالمے

رات کے پُر سکون پہر میں آخری مکالمے جاری تھے۔ کمرے میں نیم تاریکی اور عجب سی روحانی کیفیت تھی۔ مسافرِ حدیث نے اس کا نحیف ہاتھ تھاما اور آہستہ دھیمی آواز سے کہا:

... ثمینہ! یہ سب کچھ برداشت کرنا تمہارے لیے آسان نہیں ہو گا

وہ مسکرا دی — ثمینہ کی آنکھوں کی نمی نے ہی جواب دے دیا۔ لب ہلے تو گویا دل کی گہرائیوں سے آواز اٹھی

الفاظ سادہ تھے مگر وزن بہت گہرا

یہ سب کچھ اللہ کی رضا ہے... اور میں جانتی ہوں کہ رب کے سامنے صبر ہی سب سے بڑی عبادت ہے۔ میں اپنے رب کے حضور اس جبر کی شکایت لے کر جا رہی ہوں، وہ خود فیصلہ کرے گا کہ میرے صبر کا حق کیا تھا۔

گویا اپنی علالت کے چھ سال تک دل میں چھپے اس احتجاج کو لبوں تک لے آئی کہ ایسے ملک جس کے انصاف کی دھوم ساری دنیا میں مشہور ہے اور وہ خود بھی اس کی گواہ رہی ہو، آج اسی بوسیدہ نظام کے ایسے پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی شکائت اپنے رب کی عدالت میں کرنے جا رہی ہے۔

پھر وہ ٹھہر گئی... جیسے دل کے اندر کہیں بہت دور تک روشنی اتر گئی ہو۔ اس کی آنکھوں میں آخرت کا یقین اور دل میں عجب سی طمانیت تھی۔

آہستہ سے بولی

میں اب زندگی کے آخری اسٹیشن پر بیٹھی ہوں... اس ٹرین کی منتظر... جو مجھے آخر کار میری منزلِ مقصود تک پہنچا دے گی۔ اس کے ہونٹوں پر تسلیم و رضا کی وہ مسکراہٹ تھی جسے دیکھ کر قرآنِ مجید کی یہ آیت ثمینہ کی زندگی کا خلاصہ معلوم ہوتی تھی، یہ الفاظ دعا نہ رہے؛ یہ اس کی صبر آزما علالت کی **حدیثِ شہادت** بن گئے۔

﴿وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ﴾

— جو لوگ صبر کرتے ہیں انہیں خوشخبری دے دو

﴿الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾

(البقرہ 155–157)

چھ سالہ طویل آزمائش، صبر آزمائی... کرب کے موسم... بیماری کی چڑھتی اترتی لہریں... بیماری، تکلیفیں، تھکن، کرب لیکن نہ ماتھا شکوے سے شکن آلود — ہوا، نہ زبان پر گلہ آیا۔ صرف شکر اور صبر کی مہک

اس کا ہر دن گویا اعلان تھا

﴿إِنَّ اللهَ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾

بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

حدیثِ صبر — آخری مکالمے، آخری سفر

رمضان کا آخری عشرہ اس کی زندگی کے آخری روز و شب لے کر آیا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی مسافر اپنی دائمی منزل کے لیے نہایت محبت سے تیاری کر رہا ہو۔ ہم سب محسوس کر رہے تھے کہ اس رمضان المبارک میں اس کا دل عجیب سی خوشی سے بھر گیا ہے۔ مجھے لگتا تھا جیسے کوئی مسافر

اپنے سفر آخرت کے لیے سامان باندھ رہا ہو۔ بیس رمضان کی دوپہر تھی۔ اس کی بچپن کی دوست مسرت کمرے میں داخل ہوئی تو ثمینہ اپنے آئی پیڈ پر قرآن کی تلاوت میں محو تھی،

مسرت نے گلے لگایا، تو اس نے سوال کیا

بتاؤ، اس رمضان تم نے کتنے قرآن مکمل کیے...؟

خود ہی دھیمی آواز میں بولی

مجھے جب بھی حضور ﷺ کا یہ قول یاد آتا ہے کہ قرآن کی چند آیات نے مجھے بوڑھا کر دیا تو میں لرز جاتی ہوں... اس لیے دعا کرو اللہ ہماری کم فہمی کو معاف کر دے۔

پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد چہرہ روشن ہوا، جیسے کوئی اندرونی فیصلہ ہو چکا ہو

... کیا آخری عشرہ شروع ہو گیا...؟ کاش! میری رخصتی کے لیے آخری عشرہ کی کوئی مبارک رات نصیب ہو جائے

اس دن ثمینہ کو پہلی بار آخرت کی طرف مکمل آمادگی کے ساتھ دیکھا تھا۔

میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔ میں نے تسلی دی، مگر وہ مسکرا کر کہنے لگی

آرزو کرنے پر پابندی نہیں ہوتی۔

پھر خاموشی کے وقفے کے بعد اس نے سفر آخرت کی وصیتیں کر دیں۔ نہ لرزش، نہ خوف — صرف یقین

رخصتی کی وصیتیں — سکوت میں لپٹی ہوئی یقین کی باتیں

اس نے نہ لرزتی آواز میں بات کی نہ آنسو بہائے۔ پورے وقار اور غیر معمولی سکون سے کہنے لگی

اگر بلاوا آ گیا تو دیکھئے گا

میری تدفین میں تاخیر نہ کیجیے گا،

یہیں دفن کیجیے گا... تاکہ ملاقات کی سبیل باقی رہے،

میری قبر زمین کے برابر رکھیں — یہی سنت ہے۔

انہی لمحوں میں مجھے نبی ﷺ کا یہ ارشاد یاد آیا (مفہوماً)

اصل صبر وہ ہے جو صدمے کی پہلی گھڑی میں ہو

(صحیح بخاری و مسلم)

اور پھر اس نے ایک بات ایسی کہی جس نے اس کے باطن کی پاکیزگی کو عیاں کر دیا:

میں ماسوائے آپ کے دنیا میں کسی اور کی مقروض نہیں! کسی کا کوئی ادھار نہیں دینا، مگر کچھ ضرورت مندوں کو میں نے قرض دیا ہے۔ ان کے نام پردۂ اخفا میں رکھنا چاہتی ہوں، امید ہے آپ مجھے معاف کر دیں گے اور وہ اس لئے کہ شاید میرا رب بھی میری ستر پوشی فرمادے۔ اگر وہ قرض لوٹا دیں تو اسے صدقہ کر دیں، اور اگر نہ لوٹا سکیں تو میں سب کو معاف کر کے جا رہی ہوں۔

یہ الفاظ نہیں تھے،
یہ آخرت پر یقین کی تحریر تھی۔
عمل—اور پھر اللہ کی طرف سے جواب
یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایسا سکون تھا جو صرف ان لوگوں کا نصیب ہوتا ہے جنہوں نے دل سے رب پر بھروسا کرنا سیکھ لیا ہو۔

میں نے، بحیثیتِ شریکِ حیات، اس وصیت پر سو فیصد عمل کیا۔ بلکہ یہ اقرار بھی کر رہا ہوں کہ تم نے تمثیلاً میرے مقروض ہونے کی بات کہی جبکہ ہم سب تمہاری محبتوں اور احسانات کے مقروض ہیں جسے چکانے کی بھی ہمت نہیں!
نہ تاخیر ہوئی، نہ رسمیں، نہ نمائش۔ تاہم تمہاری وصیت پر من و عن عمل ہوا۔

مگر اللہ کی سنت دیکھیے.....

ثمینہ کے انتقال کے بعد، ایک ایک کر کے اس کی کئی سہیلیاں آئیں۔
اشکبار آنکھوں کے ساتھ نہ صرف قرض واپس کیا،
بلکہ ایسی ایسی خفیہ نیکیوں کا ذکر کیا
جن سے آپ خود بھی ناواقف تھے۔
وہ نیکیاں جو صرف
اللہ اور اس کے بندے کے درمیان راز ہوتی ہیں۔
تب سمجھ آیا کہ
جو اللہ کے لیے چھپاتا ہے،
اللہ اسے مخلوق پر ظاہر کر دیتا ہے۔
آج اس کی قبر کی رونق، اس کی حفاظت،
یوں محسوس ہوتی ہے جیسے ربِ کریم نے
اس کی نیکیوں کو قبول ہی نہیں کیا،
بلکہ آپ کے لیے صدقۂ جاریہ بھی بنا دیا ہو۔

وہ منظر جو کبھی نہیں بھولتا—نرسز اشکبار

—دو دن بعد اس کی طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ ہسپتال منتقل کرنے کی تیاری ہو رہی تھی۔ اس وقت بھی اس نے دوسروں کو یاد رکھا
اس نے جاتے وقت تک دینے کا عمل نہ چھوڑا، نرسوں میں خاموشی سے تحائف تقسیم کرنے کی ہدایت دی۔
بے حد دھیمی آواز میں کہا
ان تمام نرسوں میری اور اپنی طرف سے کچھ رقم دے دیجئے کہ انہوں نے میری بڑی خدمت کی ہے

... لیکن... خاموشی سے... کسی کو خبر نہ ہو

—لفافے تیار ہوئے

—خاموشی اور وقار کے ساتھ تقسیم ہوئے

—کسی دل کو ٹھیس نہ لگی، کسی پر احسان نہ جتایا گیا

یہی اس کی زندگی کا انداز تھا۔

—پھر وہ لمحہ آیا

ایمبولنس دروازے پر آچکی تھی۔

پورا نرسنگ ہوم اشکبار تھا۔ ...اور پہلی بار

جو نرسیں برسہابرس سے وہاں کام کر رہی تھیں

جو روز مریضوں کو آتے جاتے دیکھتی تھیں

جو موت سے مانوس ہو چکی تھیں

وہ سب اس کے گرد کھڑی رو رہی تھیں۔

کوئی اس کے ہاتھ سہلا رہا تھا

میٹرن فاطمہ اور سپروائزر محمد آدم درود پڑھ رہے تھے

کوئی سر جھکائے سسک رہا تھا

—یہ وہی نرسز تھیں جو چھ سال میں بے شمار مرتبہ اسے ہسپتال لے جا چکی تھیں

لیکن ایسا منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔

ڈائریکٹر سائمن کی آنسو بھری رفاقت

— نرسنگ ہوم کا ڈائریکٹر سائمن

—جو عام دنوں میں مشکل سے دستیاب ہوتا تھا

اس نے اس روز اپنی تمام مصروفیات چھوڑ دیں۔

وہ خود اپنی گاڑی میں ایمبولنس کے پیچھے پیچھے ہسپتال تک گیا۔

راستے بھر، میں اور آدم تلاوت کرتے رہے— آنسو بہتے رہے۔

جونہی ہسپتال پہنچے تو سائمن دوڑ کر میرے پاس آیا

میرا ہاتھ تھام کر کہنے لگا

... حوصلہ رکھیے

مگر خود کی آواز لرز رہی تھی۔

—میں حیران تھا

یہ سب لوگ... یہ پروٹوکول... یہ کیفیت... کیوں...؟

وہ سب لوگ جو روزانہ درجنوں مریض دیکھتے ہیں

جن کے سامنے زندگی اور موت آتے جاتے رہتے ہیں

وہ بھی یوں ٹوٹ ٹوٹ کر کیوں رو رہے تھے؟

اس کی حالت بگڑ گئی۔ ہسپتال لے جایا گیا۔—

پھر چار دن کا انتظار... جیسے شبِ قدر کا انتظار ہو۔

—اور پھر وہی ہوا

... آخری عشرہ... 27 رمضان کی مبارک شب قدر

اور ثمینہ اپنے رب کے حضور حاضر ہو گئی۔

قرآن کہتا ہے

﴿يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً﴾

—اے مطمئن جان! اپنے رب کی طرف لوٹ چل

وہ تجھ سے راضی، تو اس سے راضی

اور ثمینہ... واقعی ایسی ہی مطمئن جان تھی۔

اس کی زندگی صبر کی تفسیر تھی

— اور اس کی موت یقین کی تفسیر

اس کی پوری حیات گویا اس حدیث کی عملی تصویر تھی (مفہوماً)

اللہ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے آزمائش میں مبتلا کر دیتا ہے،

(صحیح بخاری)

—اور اب اس کی یاد ایک داستان نہیں

... **حدیثِ صبر** ہے

جو پڑھنے والے ہر دل میں ایمان، حوصلہ اور یقین کی روشنی چھوڑ جاتی ہے۔

یہ کیوں خاص تھی؟

میں آج تک سوچتا ہوں

اس معاشرے میں تو لوگ

—دو دن بعد مرحومین کو گزرا ہوا قصہ کہہ کر بھول جاتے ہیں

... لیکن ثمینہ

اب بھی ہر ملنے والے کو یاد آتی ہے

اسی شدت، اسی محبت، اسی نمی کے ساتھ۔

اور مجھے جواب ملتا ہے

یہ اللہ کے لیے صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

﴿إِنَّ اللهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ﴾

—ثمینہ چلی گئی

—لیکن اپنے پیچھے صبر کی خوشبو چھوڑ گئی

—یقین کی روشنی چھوڑ گئی

اور ایک **حدیثِ صبر** لکھ گئی

...جو پڑھی نہیں جاتی

محسوس کی جاتی ہے۔

اور شائد ان احساسات کو حدیثِ وصال کی شکل میں ترتیب دینے کا کام میرے سپرد کر کے رخصت ہو گئی۔

روحانی مکالمہ — سکون اور یقین

مسافرِ حدیث اکثر سوچتا:

کیا میں اپنی تحریروں سے دنیا کو بدل سکتا ہوں،

یا یہ سب بوجھ پھر بھی روحانی روشنی پیدا کرے گا؟

ثمینہ خاموش رہ کر

اپنی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی،

اور اس سکوت میں ایک پیغام ہوتا:

"ہر صبر، ہر آنسو، ہر دعا، اللہ کے نزدیک قبولیت کی زنجیریں ہیں۔"

یہ سکوت

مسافرِ حدیث کے دل کو چھو گیا،

اور اس نے محسوس کیا

کہ زندگی کا سب سے بڑا امتحان

— صرف جسم یا دنیا کا نہیں

بلکہ دل کی خاموشی، ایمان کی پختگی، اور عشقِ رسول ﷺ میں یقین کا امتحان ہے۔

چھ سال کی زنجیریں، چھ سال کا صبر

ہر سانس میں اللہ کی رضا چھپی

ثمینہ سمیع کی خاموش دعا

حدیثِ شہادت بن گئی

روح کی روشنی، دل کی طاقت

اور عشقِ نبوی ﷺ کی سرشاری

اب بھی ہر لمحے ہمارے ساتھ ہے

شبِ قدر کی روشنی — آخری وصیت اور آسمانی رخصت

وہ رات 27 رمضان المبارک کی تھی،

شبِ قدر،

جب فرشتے زمین و آسمان کے درمیان اترتے ہیں،

اور دعاؤں کی قبولیت کی روشنی ہر دل میں چھا جاتی ہے۔

ثمینہ سمیع،
جو چھ سال سے فالج کی زنجیریں برداشت کر رہی تھیں،
اب اپنے رب کی جانب
ایک خاموش، پُر امن سفر پر روانہ ہونے والی تھیں۔
مسافرِ حدیث نے ان کا ہاتھ تھاما،
اور خاموشی سے ان کی آنکھوں میں دیکھا،
وہ آنکھیں جو ہمیشہ صبر، عبادت، اور عشقِ رسول ﷺ میں سرشار رہی تھیں۔
طبیعت پہلے سے بہتر اور ہشاش بشاش۔
اچانک پھر سے کہنا شروع کر دیا کہ آخری عشرہ تو کل مغرب سے شروع ہو چکا ہے
یوں لگ رہا تھا کہ وہ ان ساعتوں کا شدت سے انتظار کر رہی ہے جس کا اظہار وہ پہلے بھی کر چکی تھی
ثمینہ نے دھیرے سے کہا: کیا قدر کے وقت شبِ وصال کی آرزو کی جا سکتی ہے؟
میں نے چونک کر بے ساختہ ان کے ہونٹوں پر اپنے کانپتے ہاتھ رکھ دیئے کہ علالت کے گزشتہ چھ سال کبھی ایسی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا، تو اب کیوں؟ جونہی میں نے ہاتھ اٹھایا تو گویا ہوئی:
میں اب اپنے رب کے حضور جا رہی ہوں،"
اگر ہو سکے تو علامہ اقبالؒ کی وہ رباعی تو سنائیں جو آپ ہمیشہ دعا میں پڑھا کرتے ہیں:
تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روز محشر عذر ہای من پذیر
ور حسابم را تو بینی ناگزیر
از نگاہ مصطفی پنہان بگیر

اے میرے بے نیاز محبوب!
—تو دو جہانوں کی دولت سے بھی بڑا ہے
...تو ہی ابتدا ہے، تو ہی انتہا—اور میں
میں محض ایک ٹوٹا ہوا سایہ ہوں، تیری چوکھٹ پر بیٹھی ایک فقیر،
جو تیرے نام کے سوا کچھ نہیں مانگتی۔
قیامت کے ہنگام میں جب آسمان لرزیں گے، دل کانپیں گے،
اور رازوں کے سارے پردے اٹھا دیے جائیں گے،
—تب مجھے اپنے قریب کر لینا

میری لغزشوں کو اپنی رحمت کی چادر میں چھپالینا،
میری کمزوریوں کو بہانہ بنا کر معاف کر دینا۔
—اور اگر میری خطاؤں کا حساب دیکھنا لازمی ٹھہرا
تو بس اتنی عنایت کر دینا کہ
میرا حساب میرے آقا ﷺ کی نگاہوں سے چھپا رہے۔
میں نہیں چاہتی کہ ان پاک آنکھوں کے سامنے
—میری خطاؤں کی گرد بھی آجائے
کہیں ایسا نہ ہو کہ محبت شرمندگی میں بدل جائے،
اور عشق کی یہ کہانی رسوائی کی لہر چھو لے۔
—اے ربّ کریم
—تو مجھے بخش بھی دے، چھپا بھی لے، تھام بھی لے
کہ مجھے تیرے سوا کوئی نہیں جانتا،
اور تجھ سے بڑھ کر مجھے کوئی نہیں چاہتا۔

یہ الفاظ
صرف وصیت نہیں تھے،
بلکہ چھ سالہ صبر، عشق، اور عبادت کی حدیثِ نور بن گئے۔
مجھے یکلخت حرم کعبہ پر پڑنے والی پہلی نظر کے جواب میں اس کی دعا یاد آگئی کہ اس نے تو اللہ سے اللہ ہی کو مانگ لیا تھا، اس کی قبولیت کی ساعتیں آن پہنچیں ہیں۔

مَنْ طَلَبَنِي وَجَدَنِی	جو مجھے طلب کرتا ہے پالیتا ہے
وَمَنْ وَجَدَنی عَرَفَنی	اور جو پالیتا ہے وہ مجھے پہچان لیتا ہے
وَمَنْ عَرَفَنی اَحَبّنی	اور جو مجھے پہچان لیتا ہے وہ مجھ سے محبت کرتا ہے
وَمَنْ اَحَبّنی عَشَقَنی	اور جو مجھ سے محبت کرتا ہے میرا عاشق ہو جاتا ہے
وَمَنْ عَشَقَنی قَتَلْتَہ	اور جو میرا عاشق ہو جاتا ہے میں اسے مار ڈالتا ہوں
وَمَنْ قَتَلْتَہ فَعَلَیَّ لاَزم دِیْتَہ	اور جس کو میں مار ڈالتا ہوں اس کی دیت مجھ پر لازم ہو جاتی ہے
وَدِیْتَہ اَنَاہ	میں ہی اس کی دیت ہوں

الفقر خورد از حضرت سلطان باہو قدس سرہ

میں نے اپنے مربی شیخ الحدیثؒ سے اسی دن اس دعا کے بارے میں دریافت کیا تو وہ کافی دیر ایک عجیب سی خاموشی سے کعبے کو تکتے رہے اور بس یہ گویا ہوئے: اللہ اپنے خاص بندوں کا امتحان بھی ان کو عطا کردہ درجات کے مطابق لیتا ہے۔ اسی شام انہوں نے کمال شفقت سے اپنے گھر مدعو کر لیا جو یقیناً ہم دونوں کیلئے ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ وقت رخصت دعا کی درخواست پر انہوں نے ثمینہ سے اس کی کسی خواہش کا پوچھ لیا تو یہاں بھی ثمینہ کے جواب نے ہم سب کو نہ صرف متحیر کر دیا بلکہ سکتہ کی حالت ہو گئی:

"شیخ! میں نے تو دنیا بھی کبھی اللہ سے نہیں مانگی مگر اللہ کی رضا اور حالت ایمان میں اللہ کی زیارت کی التجا کی ہے"۔ شیخ کے اٹھے ہوئے ہاتھ کچھ لمحوں کیلئے سکوت کی حالت میں نیچے گر گئے اور بعد ازاں ان کی بھیگی اور دلسوز آواز مجھے ایک بار پھر یاد آ گئی اور مجھے ثمینہ کا شبِ قدر کو رخصتی کی خواہش کی قبولیت کا اندازہ ہو گیا۔

پھر یوں ہوا کہ زندگی کے ہنگاموں کے بیچ اچانک ایک ایسی گھڑی اُتری جس نے ہر دل کو لرزا دیا... وہ لمحہ جس میں قربِ الٰہی کا پردہ جیسے تھوڑا سا سرک کر سامنے آ گیا ہو۔

مجھے آج خواب میں رسولِ کریم ﷺ کی زیارت ہوئی ہے : کسی کو مت بتایئے گا!..... ثمینہ نے اشکبار آنکھوں سے آہستہ سے بتایا۔

یہ سنتے ہی دلوں میں ایک ایسی آگ روشن ہوئی جس میں درد بھی تھا، شکر بھی، اور ایک ناقابلِ بیان کیفیت بھی۔ وہ خود سنبھلتے سنبھلتے کہتی تھیں:

میں نے دیکھا..... وہ جمال، وہ نور..... میری نظر برداشت نہ کر سکی۔ ایسا لگا جیسے ساری دنیا رک گئی ہو... اور پھر بس ایک روشنی، ایک بے مثال سکون۔ اور میں اس روشنی میں غرق ہو کر ریزہ ریزہ ہو گئی ہوں۔ میں مسلسل اس روشنی کے تعاقب میں چل رہی ہوں جیسے مجھے کوئی شانوں سے پکڑ کر آگے آنے کو کہہ رہا ہے اور میں ایک بے خودی میں سرشار مگر بڑی احتیاط کے ساتھ سر جھکائے نقشِ پا کو چومتی ہوئی اپنا سفر مکمل کر رہی ہوں۔ اس کی آنکھیں بار بار بھیگ جاتیں، اور ہم دونوں پر ایک عجیب سا سکوت چھا گیا۔

—ہم دونوں جانتے تھے

یہ خواب عام خواب نہیں... یہ **قبولیت کے دروازے کھلنے کی علامت** ہوا کرتے ہیں۔ مجھے نجانے کیوں یقین ہو گیا کہ اب دمِ واپسی ہے!

سفر آخرت — ایک خاموش وصیت، ایک روشن انجام

کچھ زندگیاں شور سے نہیں، خاموشی سے تاریخ بناتی ہیں۔
کچھ لوگ دنیا سے جاتے نہیں، دلوں میں اتر جاتے ہیں۔
اور کچھ قبریں مٹی کی نہیں ہوتیں، گواہیوں کی روشنی سے پہچانی جاتی ہیں۔
ثمینہ سمیعؒ کی زندگی بھی انہی زندہ مثالوں میں سے ایک تھی۔ سادگی، پردہ داری اور خاموش نیکیوں کی خوشبو سے معطر تھی۔ شاید اسی لیے اس کا آخری پیغام بھی شور نہیں، سکون تھا؛ نمود نہیں، سنت تھی؛ اور دنیا نہیں، آخرت کی تیاری تھی۔

وصیت — جو دنیا سے بے نیازی کی دلیل بن گئی
اپنی زندگی کے آخری ایام میں، جب موت محض ایک تصور نہیں بلکہ ایک قریب آتی حقیقت بن چکی تھی، ثمینہ نے نہ کوئی دنیاوی خواہش بیان کی، نہ کسی رسم و رواج کا بوجھ چھوڑا۔ اور نہ ہی کسی طویل وصیت نامے کا اہتمام کیا، نہ رسمی جملوں کا سہارا لیا، بس چند باتیں تھیں جو اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلیں اور ہمیشہ کے لیے دل میں اتر گئیں۔

اس کی وصیت مختصر تھی، مگر سنت، فقہ اور معرفت سے لبریز، اس نے کہا:
میرے اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد تجہیز و تکفین میں ذرا بھی تاخیر نہ کی جائے، کہ یہ سنت ہے۔
میری تدفین یہیں لندن میں ہو، مجھے کسی صورت پاکستان منتقل نہ کیا جائے، چاہے کتنے ہی اصرار کیوں نہ ہو۔
میری قبر زمین کے برابر رکھی جائے، کہ یہی طریقۂ نبوی ﷺ ہے۔
میری قبر کو پکا نہ کیا جائے، کوئی تعمیر نہ ہو۔
میرے انتقال پر کسی بھی غیر اسلامی رسم یا مجمع کا انعقاد نہ کیا جائے۔
تاہم میرے کفن کی چادروں پر وہی قطعہ لکھا جائے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت سلمان فارسی کے کفن پر لکھا تھا:

وَفَدْتُ عَلَى الْكَرِيمِ بِغَيْرِ زَادٍ،
مِنَ الْحَسَنَاتِ وَالْقَلْبِ السَّلِيمِ۔
وَحَمْلُ الزَّادِ أَقْبَحُ كُلِّ شَيْءٍ،
إِذَا كَانَ الْوُفُودُ عَلَى الْكَرِيمِ۔

— میں اپنے کریم رب کے دربار میں حاضر ہو رہا ہوں
... بغیر کسی زادِ راہ کے
نہ اعمال کی گٹھڑی ساتھ ہے، نہ نیکیوں کے انبار،
: حاضر ہوں تو صرف ایک چیز کے ساتھ
ایک ایسا دل لے کر جو تیرے لیے جھکتا ہے،
جو تیرے ذکر سے نرم پڑ جاتا ہے،
جو ٹوٹا ہوا سہی — مگر تیرے ہی نام سے جڑا ہوا ہے۔

...اور میں جانتا ہوں

—کہ جب دربار **کریم** کا ہو

تو زادِ راہ اٹھا کر آنا بھی اچھا نہیں لگتا۔

!کہاں تیری بے پایاں سخا—کہاں میرا چھوٹا سا عمل

تیری عطا کے سامنے میرا سامان کیا معنی رکھتا ہے؟

تیری رحمت کے سمندر کے سامنے

میری نیکیوں کے یہ خشک تنکے کیسے ٹھہر سکتے ہیں؟

—اسی لیے میں نے اپنے ہاتھ خالی چھوڑ دیے

کہ تو انہیں خود بھر دے۔

میں اپنی کمائی نہیں،

تیری عطا پر بھروسا کر کے آیا ہوں۔

اور اگر تو پوچھے بھی کہ کیا لے کر آیا ہے؟

:تو میں عرض کروں گا

!میرے مولا"

—نہ ثواب لایا ہوں نہ زادِ سفر

میں تو صرف ایک سچا دل لے کر آیا ہوں،

"جو تیرے حضور ٹوٹ کر جھکنا جانتا ہے۔

—کیونکہ جب رب **کریم** ہو

تو مانگنے والے کے پاس صرف دل ہونا کافی ہے۔

ثمینہ مرحومہ اکثر ایک عرب شاعر کے اشعار پڑھا کرتی تھیں۔

یہ وہ اشعار ہیں جن کو امام شافعیؒ سے منسوب تو کیا جاتا ہے لیکن کوئی مضبوط سند نہیں تاہم اسے محاسبۂ نفس کا قصیدہ کے نام سے پکارا جاتا ہے جن کے بارے میں امام ابن الجوزیؒ لکھتے ہیں کہ امام احمد بن حنبلؒ انہیں پڑھتے ہوئے اس قدر روپڑتے تھے کہ یوں محسوس ہوتا جیسے سانس رک جائے گی۔

یہ اشعار موت، حساب اور ندامت کی ایسی تصویر ہیں

جو دل کو ہلا دیتے ہیں:

إِذَا مَا قَالَ لِي رَبِّي أَمَا اسْتَحْيَيْتَ تَعْصِينِي
وَتُخْفِي الذَّنْبَ عَنْ خَلْقِي وَبِالْعِصْيَانِ تَأْتِينِي
فَكَيْفَ أُجِيبُ يَا وَيْحِي وَمَنْ ذَا سَوْفَ يَحْمِينِي
أُسَلِّي النَّفْسَ بِالْآمَالِ مِنْ حِينٍ إِلَى حِينِ

وَأَنْسَى مَا وَرَاءَ الْمَوْتِ مَاذَا بَعْدَ تَكْفِينِي
كَأَنِّي قَدْ ضَمِنْتُ الْعَيْشَ لَيْسَ الْمَوْتُ يَأْتِينِي
وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ الشَّدِيدَةُ مَنْ سَيَحْمِينِي
نَظَرْتُ إِلَى الْوُجُوهِ أَلَيْسَ مِنْهُمْ مَنْ سَيَفْدِينِي
سَأُسْأَلُ مَا الَّذِي قَدَّمْتُ فِي دُنْيَايَ يُنْجِينِي
فَكَيْفَ إِجَابَتِي مِنْ بَعْدِ مَا فَرَّطْتُ فِي دِينِي
وَيَا وَيْحِي أَلَمْ أَسْمَعْ كَلَامَ اللهِ يَدْعُونِي
«أَلَمْ أَسْمَعْ بِمَا قَدْ جَاءَ فِي «قَافٍ» وَ«يَاسِينِ
أَلَمْ أَسْمَعْ بِيَوْمِ الْحَشْرِ يَوْمِ الْجَمْعِ وَالدِّينِ
أَلَمْ أَسْمَعْ مُنَادِيَ الْمَوْتِ يَدْعُونِي يُنَادِينِي
فَيَا رَبَّاهُ عَبْدٌ تَائِبٌ مَنْ ذَا سَيُؤْوِينِي
سِوَى رَبٍّ غَفُورٍ وَاسِعٍ لِلْحَقِّ يَهْدِينِي
أَتَيْتُ إِلَيْكَ فَارْحَمْنِي وَثَقِّلْ فِي مَوَازِينِي
وَخَفِّفْ فِي جَزَائِي أَنْتَ أَرْجَى مَنْ يُجَازِينِي

ترجمہ:

اگر قیامت کے دن میرا رب مجھ سے یہ کہہ دے
کیا تجھے مجھ سے شرم نہ آئی کہ نافرمانی کرتا رہا؟"
لوگوں سے اپنے گناہ چھپاتا رہا
اور خود میرے سامنے گناہوں کے ساتھ آتا رہا
تو پھر میں کیا جواب دوں گا...؟ ہائے میری بدنصیبی
اس دن مجھے کون بچانے والا ہو گا؟
میں تو اپنی جان کو وقتی امیدوں کا سہارا دے کر بہلاتا رہا،
ایک لمحے سے دوسرے لمحے تک خود کو دھوکے دیتا رہا۔
میں موت کے بعد کے سفر کو بھول گیا،
کفن کے بعد کیا ہونا ہے—میں نے کبھی سوچا ہی نہیں،
جیسے میں نے زندگی کی گارنٹی لے رکھی ہو
اور موت مجھے کبھی چھونے نہیں آئے گی
—پھر اچانک موت کی سخت بے ہوشی آ پہنچے گی
تو مجھے ڈھانپنے، بچانے والا کون ہو گا؟
—میں چہروں کی طرف دیکھوں گا
کیا ان میں سے کوئی ہے جو مجھے بچا لے گا؟

کوئی عزیز؟ کوئی دوست؟ کوئی رشتہ؟

...لیکن سب بے بس ہوں گے

مجھ سے پوچھا جائے گا:

دنیا میں کیا لے کر آئے تھے؟"

"کیا کر کے آئے ہو جو آج تمہیں نجات دے؟

میں اپنی دینی کوتاہیوں کا کیا جواب دوں گا؟

—کیا میں نے اللہ کا کلام نہیں سنا تھا

جو بار بار مجھے بلا رہا تھا؟

کیا میں نے سورۂ قٓ اور یٰسین میں آنے والی مار

پکار نہیں سنی؟

کیا میں نے حشر کے دن، جمع ہونے کے دن، بدلے کے دن کا تذکرہ نہیں سنا؟

—کیا موت کی صدا روز میرے کانوں میں نہیں پڑتی تھی

"لوٹ آؤ—تمہاری باری قریب ہے"

...اور پھر بھی میں غفلت میں رہا

تو اب، اے میرے رب!

تیرا بندہ تیری طرف لوٹ آیا ہے—ٹوٹا ہوا، شرمندہ، روتا ہوا۔

میرے لیے کون پناہ گاہ ہے تیرے سوا؟

—تو ہی غفور ہے

تو ہی رحمت کا سمندر،

تو ہی حق کی طرف رہ نمائی کرنے والا ہے۔

—میں تیرے در پر آ گیا ہوں

مجھ پر رحم کر دے،

میرے میزان میں بھلائیاں بھاری کر دے،

—میرا حساب ہلکا کر دے

تو ہی وہ ہے

جس کی جزا سے بڑھ کر کسی سے کوئی امید نہیں۔

وہ آخری لمحے —جدائی کا زخم، وصال کی امید

سوچتا ہوں کیا میرے لئے یہ کیفیت لفظوں میں سمیٹنا آسان ہو گا... مگر میں پوری محبت اور پوری سچّی سوزِ دِل کے ساتھ وہ منظر، وہ جدائی، وہ وعدہ، وہ گفتگو، وہ خاموشی اور وہ ابدی ملاقات کی امید ایک مسلسل بیانیہ شائد مکمل نہ کر سکوں لیکن ملک کی مایہ ناز دانشور لکھاری میری بہن نجیبہ عارف صاحبہ کا تقاضہ ہے کہ اس ساری روداد کا محرک بھی تحریر کروں، کس قدر مشکل مطالبہ کر دیا میری بہن نے! ہمارے ہاں یہ بڑی مستند روایت ہے کہ بہنوں کی خواہش کی تعمیل میں بڑی برکت ہوتی ہے، اور مجھ میں ٹالنے کی ہمت بھی نہیں!

کمرے میں ساون کی ہلکی بھینی خوشبو تھی، جیسے آسمان بھی اس جدائی کے سامنے خاموش ہو کر احترام سے جھک گیا ہو۔ زندگی کے وہ لمحے جب آنکھوں کے سامنے اپنی زندگی کی سانسیں بیٹھتی محسوس ہوں، وہ آخری لمحے —جب وقت تھم گیا، سانس رُک گئی، اور محبت ہمیشہ کے لیے امر ہو گئی، جب روح کے اندر کوئی دھاگہ ٹوٹ رہا ہو، اور جب دل کسی ابدی ویرانی کا دروازہ کھلتا ہوا محسوس کرے... وہ لمحے ہمیشہ کے لیے دل پر نقش ہو جاتے ہیں۔

زندگی کے وہ لمحے جب آنکھوں کے سامنے اپنی زندگی کی سانسیں بیٹھتی محسوس ہوں، وہ آخری لمحے —جب وقت تھم گیا، سانس رُک گئی، اور محبت ہمیشہ کے لیے امر ہو گئی، جب روح کے اندر کوئی دھاگہ ٹوٹ رہا ہو، اور جب دل کسی ابدی ویرانی کا دروازہ کھلتا ہوا محسوس کرے... وہ لمحے ہمیشہ کے لیے دل پر نقش ہو جاتے ہیں۔

—ثمینہ کے ساتھ میرے وہ آخری لمحات

اللہ گواہ ہے —ایسے تھے جیسے کوئی نور آہستہ آہستہ آسمان کی طرف بلند ہو رہا ہو اور میں ہاتھ بڑھا کر اسے تھام لینا چاہتا ہوں، مگر مقدر اسے آگے کھینچتا جاتا ہے

کمرے میں ہلکی سی روشنی جل رہی تھی۔

پردے آہستہ آہستہ ہوا سے ہل رہے تھے، جیسے وہ بھی سانسیں ٹوٹنے کی آہٹ پر لرز رہے ہوں۔

—ثمینہ بستر پر لیٹی تھی

چہرہ سکون میں ڈوبا ہوا، مگر آنکھوں کے نیچے تھکن کی گہری لکیریں............

اور میں اس کے سرہانے بیٹھا ہر گزرتے لمحے کے ساتھ یوں ٹوٹ رہا تھا جیسے اندر کہیں کوئی ستون گر رہا ہو۔

اس نے میری طرف دیکھا۔

آنکھوں میں عجیب سی خاموش چمک............

وہ چمک جو صرف اُن لوگوں کی آنکھوں میں اُترتی ہے جنہیں آخری سفر کی خبر آ جاتی ہے۔

—میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا

اس کی انگلیاں پہلے جیسی گرم نہیں تھیں۔

وہ سردی آہستہ آہستہ میرے ہاتھوں میں اتر رہی تھی، مگر میں نے چھوڑا نہیں۔

جیسے میں اس لمحے کو روک لوں گا.....

جیسے موت بھی میرے ہاتھ کی مضبوط گرفت سے ڈر کر پلٹ جائے گی۔

ثمینہ نے دھیمی آواز میں کہا:

میں جہاں جارہی ہوں وہاں اب کوئی مشکل اور پریشانی نہیں!..... آپ میری فکر چھوڑ دیں... میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔

آپ کو تو یاد ہو گا کہ نئے گھر میں جانے سے پہلے میں ہی تو اس کی سجاوٹ کیلئے جاتی ہوں تا کہ نئے گھر میں داخل ہوتے وقت آپ کے چہرے کی تمام خوشیوں کو اپنے دل میں محفوظ کر لوں اور تم بھی تو جی بھر کر میری تعریف کے پل باندھ دیتے تھے، بس وہی کام کرنے کیلئے مجھے پہلے جانا ہو گا!

بس ایک بات یاد رکھنا.....

رونا قطعاً نہیں۔

میں نے اپنی ساری عمر ان خوبصورت آنکھوں میں آنسوؤں کو داخل ہونے کی قطعاً اجازت نہیں دی۔ اس کی دھیمی آواز اب بھی کانوں میں گونجتی ہے:

تم رونا مت... میرا سفر قریب ہے، لیکن یہ جدائی ہمیشہ کی نہیں۔ ہم نے ساتھ رہنے کی دعا دنیا میں بھی کی تھی... اور آخرت میں بھی ایک ساتھ رہنے کا وعدہ ہے۔ ہم نے ایک ساتھ رہنے کی دعا کی تھی نا؟

یہ کہتے ہوئے بھلا تم کیوں رو پڑی تھی؟

میں نجانے کہاں گم تھا کہ اس سے رونے کی وجہ ہی نہیں پوچھ سکا جبکہ مجھے یاد ہے کہ اس کی تو آنکھیں بھی ہر وقت مسکراتی رہتی تھیں۔

—میں نے اس کے ہاتھ تھامے تو وہ ہولے سے مسکرا دی

ایسی مسکراہٹ جس میں محبت بھی تھی، یقین بھی، اور ایک عجیب سی روحانی شان بھی۔

اس لمحے دل نے بس ایک ہی شعر کہا:

یہ جدائی بھی عجیب ہے، یہ ملاقات بھی عجب

تو کہیں پاس نہیں، پھر بھی مرے دل میں ہے تُو

وہ دعا دنیا تک محدود تھوڑی تھی.....

آخرت میں بھی ایک ساتھ رہنے کا وعدہ ہے۔

میری آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

میں انکار نہ کر سکا۔

دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا ہو۔

ثمینہ کے ساتھ میرے وہ آخری لمحات

اسی دوران وہ واقعہ پیش آیا جسے یاد کر کے آج بھی دل کانپ جاتا ہے۔

وہ جمعرات کی شام تھی.....شبِ قدر ستائیسویں رات کا خاموش آغاز، میرا دل انتہائی بوجھل، اور ہوا میں ایک انجانی سی بے چینی۔

وہ ہسپتال کے بستر پر مجھ سمیت بیٹوں کے حصار میں ان سب کو دیکھ رہی تھی۔

وہ بچوں کو اپنے پاس بلاتی ہیں، ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتی جاتی ہیں، جیسے کوئی ماں آخری بار اپنی ممتا کو لفظوں میں سمیٹ رہی ہو،

پھر ہولے سے کہتی ہیں:

مجھے محسوس ہوتا ہے... میرا سفر قریب ہے۔ بس تم سب اللہ، نماز، قرآن، آپس میں محبت..... کے راستے کو تھامے رکھنا۔

بچوں کو آخری نصیحت کر رہی تھی:

اپنے باپ کو اکیلے مت رہنے دینا، ان کے وقت پر کھانے پینے اور خوش لباسی کے اہتمام کا خوب احترام کرنا، یہ اپنے دل کی باتیں ماسوائے میرے کسی سے شئیر نہیں کرتے اور سب سے بڑی بات کہ انہیں اداس دیکھو تو فوری طور پر ان کی خاموشی کو ختم کرنے کیلئے چھوٹے پوتے پوتیوں کو ان کے گرد جمع کر دینا.....

رخصت ہوتے ہوئے بھی میری یہ فکر.....

—یہ کہہ کر وہ مسکرا دیں

وہی مسکراہٹ جو ہمیشہ گھر کو روشنی دیتی تھی، لیکن اس رات اس مسکراہٹ میں ایک جدائی کی نمی تھی۔

باہر شام ڈھل رہی تھی۔

کمرے میں ہلکا سا ساون کی بھینی خوشبو تھی، جیسے آسمان بھی اس جدائی کے سامنے خاموش ہو کر احترام سے جھک گیا ہو۔

بالآخر پھر وہ لمحہ آیا جب اس کی سانس مدھم ہوئی، اچانک اس کی سانسیں ہلکی ہونے لگیں

بیٹے ابرار نے بلند آواز میں کلمہ شہادت پڑھنا شروع کر دیا اور ثمینہ اس کو بلند آواز میں دہراتی رہی۔

...چند لمحوں بعد وہ کیفیت پیدا ہوئی جسے بیان کرنے میں بھی دل ٹوٹتا ہے

ان کے ہاتھ ٹھنڈے پڑتے گئے، سانس مدھم ہوتی گئی، مگر چہرہ... سبحان اللہ... ایسا لگتا تھا جیسے نور اوڑھ لیا ہو۔

ماں جی اور دیگر تمام افراد کمرے میں ان کے ارد گرد قریب بیٹھے قرآن پڑھتے ہوئے اپنے آنسو روکنے کی کوشش کرتے رہے، اور یوں محسوس ہو رہا تھا

—کہ جیسی ان کی خاموش نگاہیں ہر ایک کو آہستگی سے انگلی کے اشارے سے چپ کروا رہیں ہوں

جیسے کہہ رہی ہوں:

"رونا نہیں... میرا رب راستہ آسان کر رہا ہے....."

ہاتھ ٹھنڈے ہوئے،

اور چہرے پر ایک ایسا نور آ گیا جس نے مجھے رلا دیا.....

یہ وہ نور تھا جو صرف اُن کے چہروں پر آتا ہے جن کا سفر آسان ہو چکا ہوتا ہے۔

میں جھک کر اس کے چہرے کو دیکھنے لگا:

وہ مسکرائی.....بہت آہستہ...بہت دھیرے

ایسی مسکراہٹ جیسے کوئی فرشتہ کسی کو رُخصت کرتے ہوئے چہرے پہ رکھ دیتا ہے۔

اور اس لمحے.....

وقت رک گیا۔

اس کی سانس ٹوٹ گئی۔

پچھلے ایک گھنٹے سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھام رکھا تھا جیسے وہ حرم میں طواف کے دوران پکڑ کر رکھتی تھیں۔

میرے ہاتھ میں اس کا ہاتھ جدائی کا ایک نرم پیغام دے گیا کہ یہ وقت کی گواہی ہے کہ آخری سانس بھی تمہارے ہاتھوں میں لیا اور اب میں وہاں بھی تمہارا اسی طرح انتظار کروں گی جیسا ساری عمر ہر شام تمہارے مسکراتے چہرہ کا کیا کرتی تھی۔ بخدا، میں ساری عمر یہی دعا کی تھی اور آج اس کی قبولیت کو بھی دیکھ رہی ہوں۔

پھر آخری لمحے.....

آنکھیں بند ہونے لگیں...ہلکی سی جنبش...اور ایک ایسی خوشبو جو کمرے کی دیواروں تک میں اتر گئی۔

میرا دل جیسے چیخ کر پھٹ گیا۔

میں نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر کہا:

ثمینہ !ایک لمحہ اور ٹھہر جاؤ، ہم نے ابھی بہت سی باتیں کرنی تھیں.....

یہ محفل ابھی ادھوری ہے.....

یہ گھر ابھی خالی نہیں ہوا

مگر وہ جا چکی تھی۔

کمرہ عجیب سکوت میں ڈوب گیا۔

ایسا سکوت جو روح کو نگل لیتا ہے۔

میں نے اس کا بے جان ہاتھ سینے سے لگا لیا۔

جیسے آخری بار اس کی زندگی کے آثار اپنے دل میں محفوظ کر لوں۔

چل دیے یار کہ رستہ بھی وہی تھا، منزل بھی

میں اکیلا ہی کھڑا رہ گیا، دھول بھی تھی اور شام بھی

اس رات میں نے پہلی بار جانا.....

محبت موت سے بڑی ہوتی ہے،

مگر جدائی دل کو چیر دینے والی۔

اس دن کے بعد سے زندگی جیسے رُک گئی۔

—گھر کی وہ پاکیزہ محفل—جہاں ہر روز ذکر ہوتا، باتیں ہوتیں، ہنسی بکھرتی، قرآن کی آیتیں گونجتیں

سب کچھ جیسے اچانک اُجڑ گیا۔

ہر کونا، ہر چیز چیخ چیخ کر کہنے لگی:

وہ اب یہاں نہیں.....!

اس رات میں نے پہلی بار جانا.....

محبت موت سے بڑی ہوتی ہے، مگر جدائی دل کو چیر دینے والی۔

یوں لگا جیسے رحمت کے فرشتے کمرے میں اترے ہوں۔

...اور وہ اپنے رب کے حضور چلی گئیں

ایک سکون، ایک نور، اور ایک خاموش دروازہ پیچھے چھوڑ کر۔ یوں لگا جیسے وہ کہہ رہی ہو!

خدا کی قسم! یاد آیا کروں گی

کہو گے کہ وہ جانِ محفل کہاں ہے

یہ واقعات بعد میں جب بھی یاد آتے، دل میں ایک ہی جملہ گونجتا ہے:

"کچھ لوگ رخصت نہیں ہوتے.....وہ پردے کے پیچھے چلے جاتے ہیں۔"

دشت میں پیاس بجھاتے ہوئے مر جاتے ہیں
ہم پرندے کہیں جاتے ہوئے مر جاتے ہیں
ہم ہیں سوکھے ہوئے تالاب پہ بیٹھے ہوئے ہنس
جو تعلق کو نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں
گھر پہنچتا ہے کوئی اور ہمارے جیسا
ہم ترے شہر سے جاتے ہوئے مر جاتے ہیں
کس طرح لوگ چلے جاتے ہیں اٹھ کر چپ چاپ
ہم تو یہ دھیان میں لاتے ہوئے مر جاتے ہیں
ان کے بھی قتل کا الزام ہمارے سر ہے
جو ہمیں زہر پلاتے ہوئے مر جاتے ہیں
یہ محبت کی کہانی نہیں مرتی لیکن
لوگ کردار نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں
ہم ہیں وہ ٹوٹی ہوئی کشتیوں والے تابشؔ
جو کناروں کو ملاتے ہوئے مر جاتے ہیں

عرش کی دعوت

اسی رات، رب نے ثمینہ سمیع کو بلایا۔
ان کے قدم
آسمانی روشنی کی طرف بڑھ رہے تھے،
اور ہر لمحہ
فرشتے ان کے لیے پروں کا سایہ بن کر موجود تھے۔
یہ ایک ایسا لمحہ تھا
جو دنیا کے کسی شاعر یا مصور کے تصور سے بھی باہر تھا
روح کی خوشبو،
نور کی روشنی،
اور عشقِ رسول ﷺ کی سرشاری
ایک ساتھ محسوس ہو رہی تھی۔

جمعۃ الوداع — جنازہ اور رحمت کی بارش

دن نکل آیا۔
جمعۃ الوداع کے دن،
امت نے اپنے ہاتھوں سے
ثمینہ سمیع کو آخری الوداع کیا۔
جب وہ لحد میں اتاری گئیں،
آسمان سے ایک ہلکی، خوشبو دار بارش برسنے لگی،
جو گویا ان کے استقبال کے لیے اللہ کی رحمت تھی۔
بارش کی ہر بوند،
زمین کی خوشبو،
اور فرشتوں کی آوازیں
ان کے آخری لمحے کو
زمین اور آسمان کے درمیان
ایک روحانی پل بنا گئی۔

مرثیہ — ثمینہ سمیع، حدیثِ نور

ثمینہ سمیع.....
پاکیزہ روح،
محبتِ رسول ﷺ کی سرشار،
خوفِ خدا میں لرزتی،
صوم و صلوٰۃ کی پابند.....
شبِ قدر کی خلوت میں
اب اپنے رب کے حضور جا پہنچی۔
جمعتہ الوداع کی روشنی میں
لحد کی گود میں،
بارش کی نرم خوشبو کے ساتھ
رحمت کی خوشبو نے استقبال کیا۔
تم نے دنیا میں صبر اور عبادت کا چراغ جلایا
اب تمہاری روشنی
آسمان کی گود میں قائم ہے۔
تمہارا نام، تمہاری دعا
ہمیشہ ہماری زندگی میں
حدیثِ نور کی مانند روشن رہے گی۔

شبِ قدر کی روشنی میں اُٹھتی روح
بارش کی نرم بوندوں میں چھپی خوشبو
ثمینہ سمیع کی ہر دعا
ہر صبر، ہر آنسو، ہر عبادت
اب آسمان کی گود میں جا کر
رب کے حضور نور کی مانند روشن ہوئی

زیارتِ قبر

میں ہر روز اس کی قبر پر جاتا ہوں۔

فاتحہ پڑھتا ہوں،

—اس کے پاس بیٹھ کر دل کی ساری باتیں کرتا ہوں

—جو خوشی ہو، جو غم ہو، جو سوال ہو، ہر بات

جیسے وہ سامنے بیٹھی سن رہی ہو۔

لوگ تعجب کرتے ہیں کہ میں کیوں اتنی دیر قبر پر بیٹھا رہتا ہوں.....

میں ان کی آنکھوں میں دیکھ کر بس اتنا کہتا ہوں:

"یہ رشتہ دنیا کا نہیں تھا... یہ روح کا تھا، اور روح کے رشتے کبھی ختم نہیں ہوتے۔"

قبر پر پہلی ملاقات

دفن کے بعد جب پہلی بار اس کی قبر پر بیٹھا تو مٹی ابھی گیلی تھی۔

خوشبو بھی اسی کی تھی۔

میں نے ہاتھ رکھ کر کہا:

ثمینہ، تم چلی گئی ہو... مگر تمہاری جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ میں ساری زندگی دنیا بھر میں تمہیں ساتھ لیکر چلتا رہا جبکہ تم کبھی کبھار کئی ایک مصروفیات کا بہانہ بنا کر مجھے اکیلے جانے پر مجبور بھی کرتی تھیں لیکن میں نے کبھی تمہاری بات کبھی نہیں مانی اور تم میری ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیتی تھی لیکن اب کیا کروں؟

تمہارے بغیر گھر ویسا نہیں رہا.....

میں بھی ویسا نہیں رہا۔

—میں دیر تک بیٹھا رہا

ہچکیوں کے ساتھ، تھکے ہوئے دل کے ساتھ، مگر ایک عجیب سی محبت کے ساتھ جس نے مجھے واپس جانے نہیں دیا۔

اس کے بعد میں روز جاتا ہوں۔

وہاں بیٹھتا ہوں، اس سے باتیں کرتا ہوں، ساری کارگزاری سناتا ہوں:

کب ہنسا، کب ٹوٹا، کب رات جاگی.....

وہ سب کچھ جو دنیا نہیں سمجھ سکتی۔

اس کی سہیلیاں مجھ سے کبھی کبھی شکایت کرتی ہیں:

"وہ ہمیں خواب میں آتی ہے، تمہیں کیوں نہیں؟"

یہ سوال میرے دل کو کاٹتا رہا.....!

ایک دن میں نے قبر پر جھک کر رازدانہ لہجے میں سرگوشی کی، کہ ساتھ والی قبور میں آرام کرنے والوں تک بھی میری آواز نہ پہنچے، تاکہ ساری عمر رازداری کی عادت جو تم نے ڈال رکھی تھی:

تم مجھے خواب میں کیوں نہیں آتیں؟"

کیا میں اس لائق نہیں؟

یا میرا دل ہی کمزور ہے؟

کیا تم کو میری کوئی بات نہیں یاد آتی...؟"

کیا میں اس قابل بھی نہیں کہ تم ایک بار خواب میں آجاؤ؟

——قبرستان سے لوٹ رہا تھا کہ دل کی گہرائیوں سے ایک بہت نرم سی آواز اٹھی

ایسی جیسے اس کا لہجہ ہو، بالکل اس کے مترنم لہجے اور کھنکتی ہنسی میں:

خواب اُن کے پاس جاتے ہیں جو بھول رہے ہوں.....

اور تم تو ہر روز میرے پاس آجاتے ہو،

پورا وقت میرے ساتھ بیٹھتے ہو،

میرے دل کی بات سنتے ہو.....

"تو پھر خوابوں کی ضرورت ہی کیا ہے؟

تمہیں میری ضرورت خواب میں نہیں،

میں ٹھٹھک کر رک گیا۔

آسمان کی طرف دیکھا.....

اور پہلی بار دل کو یقین ہوا کہ محبت مرنے سے نہیں مرتی۔

خواب کے اندر خواب کا منظر

پھر سے تم کو خواب میں دیکھا

سوتے سوتے جاگ گیا میں

میں یہ سمجھا تم آئی ہو

آہٹ پا کر بھاگا گیا میں

دروازہ مگر ویران پڑا تھا

دل پاگل حیران بڑا تھا

سامنے وہ اک پری کھڑی تھی

مجھ سے آ کر بول رہی تھی
جانتی ہوں میں
تم نے مجھ سے پیار کیا ہے
کون ہے مجھ کو اتنا چاہے
آدھی رات اٹھے بستر سے
آہٹ پا کر دوڑا آئے
تم بھی کتنے پاگل ہو ناں
آدھی رات کو جاگ رہے ہو
مجھ کو رب سے مانگ رہے ہو؟
آ گئی ہوں ناں
قید کرو گے؟
یا پھر مجھ کو جانے دو گے؟
اچھا پھر سے کھو دو گے؟؟
صحرا صحرا پھر ڈھونڈو گے؟
فیصلہ کر لو
ڈور تمہارے ہاتھ میں ہے
واحد تم ہو جس کے اندر
میں نے یہ ہمت دیکھی ہے
مجھ کو ہی تم ہر دم
چاہے جاؤ چاہے جاؤ
فیض ملے نہ
پھر بھی اس سے پیار نبھاؤ
حیرت ہے ناں
ساری دنیا مطلب کی ہے
لیکن کتنا سوچا میں نے
دنیا میں کوئی کس کا؟ کب ہے؟
تم کو مجھ سے کیا مطلب ہے؟
کچھ بھی نئیں ناں•••••

جانے کیا ہے
میں نے ان آنکھوں کے اندر
اتنی حیرت کیوں دیکھی ہے
اتنی چاہت کیوں دیکھی ہے
جب ہی تم سے پوچھ رہی ہوں
قید کرو گے ؟
قیدی بن کر رہ لوں گی میں
دنیا والے بھاڑ میں جائیں
تانے وانے سہہ لوں گی میں
چاہے گا کوئی ٹوٹ کے مجھ کو ؟
لیکن بس تم
سوچ رہی ہوں
سوچ رہی ہوں تم کو اتنا اذن میں دے دوں
مجھ کو آنکھ میں کاجل کر لو
جب بھی چاہو دیکھ لو مجھ کو
خواب بنا کر آنکھ میں بھر لو
بھرنا ہے کیا••••••••••؟
اور برا نہ مانو تو میں
اندر آؤں ؟
میں بھی کتنا پاگل ہوں ناں
دروازہ بھی کھول دیا ہے
اور کھڑا ہوں روک کے رستہ
اندر آیئے بیٹھیے بھی ناں
پانی لاؤں ؟
دانتوں میں پھر ہونٹ دبا کر
بکھری زلفیں سلجھا کر
میچ کے آنکھیں رو دیا ہوں میں
سوچ رہا ہوں

انسو پونچھو

ہاں! پونچھو بھی اب

لیکن یہ تو خواب ہے ناں

خواب کے اندر خواب کا منظر

اور یہ آنسو۔۔۔۔۔۔۔۔

بھیگے عارض۔۔۔۔ بھیگا تکیہ

افففف افففف

فقط پردہ درمیان میں آجاتا ہے۔

اس کو رخصت تو کیا تھا مجھے معلوم نہ تھا

سارا گھر لے گیا گھر چھوڑ کے جانے والا

میں وہیں رک گیا۔

آسمان کی طرف دیکھا اور دل میں ایک ٹھنڈک اتر گئی۔

یہ جواب فقط میرے لئے تھا.....

یہ اس کے رب کا عطا کردہ اطمینان تھا۔

—اور یوں جان لیا کہ ہمارا رشتہ ختم نہیں ہوا

بس پردہ درمیان میں آگیا ہے۔

یہ جدائی بھی عارضی ہے، وصال بھی باقی

—جو بچھڑتے ہیں محبت سے، وہ دوبارہ ملتے ہیں

اور اس بار ہمیشہ کے لیے۔

ہوا ہے تجھ سے بچھڑنے کے بعد یہ معلوم

کہ تو نہیں تھا ترے ساتھ ایک دنیا تھی

حدیثِ امید — تنہائی اور بیٹی کی آمد

ثمینہ سمیع کی رخصت کے بعد،
مسافرِ حدیث کی زندگی ایک خاموشی میں ڈوب گئی۔
گھر کے ہر گوشے میں
ان کے قدموں کی یادیں،
ان کی خدمت کے آثار،
اور ان کی دعاوں کی روشنی باقی تھی۔
مسافرِ حدیث اکثر اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس بیٹھتا،
اور خاموشی سے سوچتا:
یہ زندگی کی آخری روشنی کہاں گئی؟
یہ دل کی روشنی کہاں چھپ گئی؟
اگر ثمینہ نہ ہوتی
"...تو میری تحریریں بھی خالی رہ جاتیں

حدیثِ تنہائی — دل کی خاموش چیخ

چھ سال کا صبر،
چھ سال کی آزمائش،
اب ختم ہو چکی تھی،
مگر دل کے اندر ایک خلا باقی رہ گیا تھا۔
اس خلا کو پر کرنے کی کوشش میں
مسافرِ حدیث نے اپنی تحریروں کی دنیا میں غرق ہو گیا،
لیکن پھر بھی ہر لفظ میں
ثمینہ کی یاد زندہ رہتی۔
ہر کتاب کا ہر لفظ
اس کے رب کی توفیق سے لکھا گیا،
مگر دل کی خلا کو صرف وہی مکمل کر سکتی تھی۔

لکھنے پڑھنے کے عمل میں شاعری یقیناً ایک خوشنما اور دلربا بیانیہ ہے جو انتہائی اختصار کے ساتھ مخاطب کے کانوں سے ہوتا تو دل کے اندر ایسا سرائت کرتا ہے کہ قاری کو دل تھامنا مشکل ہو جاتا ہے۔46 برس کی رفاقت کے بعد اہلیہ بروز جمعرات 27 رمضان الکریم 1439ھ کی مبارک شب کو ہم سب

کی آنکھوں کے سامنے ہم سب کو گواہ بنا کر باآواز کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے اس فانی دنیا سے رخصت ہو گئیں اور ان کی وصیت کے مطابق اگلے دن جمعتہ الوداع کے ساتھ مجھے نماز جمعہ کے ساتھ ہی ان کو الوداع کہتے ہوئے نماز جنازہ بھی پڑھانی پڑی کہ وہ اپنی زندگین کے آخری سانسوں میں مجھ سے یہ مطالبہ کیا تھا۔ میری کیا کیفیت تھی؟ میں اسے باوجود اپنی انتہائی کوشش کے آج تک ضبطِ تحریر میں نہیں لا سکا تھا تاہم پہلی اور شائد آخری مرتبہ کچھ اشعار سرزد ہوئے:

کوئی نہ جان سکا وہ کہاں سے آیا تھا
خدا نے جس کو مرے ہی لیے بنایا تھا
وہ رات، قدر کی شب، جمعرات کا دن تھا
کہ جب بہشت میں رب نے اسے بلایا تھا
مکان اس کا سجایا وہاں فرشتوں نے
کہ جس کو لینے فرشتہ خود زمیں پہ آیا تھا
وہ میری زیست مری زندگی مرا حاصل
ہر ایک چیز کو کھویا تو اس کو پایا تھا
وہ اب وہاں ہے جہاں جیتے جی نہیں جاتے
زہے نصیب جو میرا، میں جس کا سایہ تھا
طیورِ جنتِ فردوس بھی چہکتے ہیں
اس ایک راگ میں جو اس نے گنگنایا تھا
اب اس شجر کا وہ پھل کھا رہا ہے ہر لحظہ
کہ آخرت کے لیے اس نے جو لگایا تھا
سکون آیا میرے کپکپاتے ہونٹوں کو
جب اس کا ہاتھ میرے ان لبوں تک آیا تھا
بدن کو چھوڑ کے جانا ہے آسماں کی طرف
یہی وفات نے اس کی سبَق پڑھایا تھا
ہے میرے دل میں فروزاں اسی کی یاد سمیع
وہ اِک چراغ جسے قدر نے بُجھایا تھا

قدر۔۔۔۔۔27 رمضان المبارک 1439ھ

پرندوں کا راز—وہ محیر العقول نورانی واقعہ جو آج تک کوئی سمجھ نہیں سکا

ہاں ایک اور محبت بھرا مگر محیر العقول واقعہ جس نے میرے ارد گرد شدید محاصرہ کر لیا ہے کہ اس کو بھی تحریر کروں۔ یقیناً واقعی یہ **دل اور روح کی سرحدوں کو چھو لینے والا** ہے—ایسا منظر جس کی خوشبو بھی نور کی طرح دل میں اترتی ہے۔ اس واقعہ کی صوفیانہ فضا، ثمینہ کی پاکیزہ روح کے نورانی رنگ میں ایک **مکمل، مربوط جو مجھے حد درجہ جذباتی کر دیتا ہے:**

پرندوں کا راز—وہ محیر العقول نورانی واقعہ جو آج تک کوئی سمجھ نہیں سکا

پرندوں کی وفا—ثمینہ کی روح کا وہ راز جسے آج تک کوئی نہ سمجھ سکا

—ثمینہ کی زندگی میں ایک عجیب سی روحانی لطافت اور نورانی نرمی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی

ایسی لطافت جو اس کے ہر عمل سے جھلکتی،

ہر مسکراہٹ سے برستی

اور ہر قدم سے روشنی کی طرح پھیلتی تھی۔

محبت اس کے گرد یوں لپٹی ہوئی تھی جیسے بہار اپنے پھولوں کو گود میں رکھتی ہے۔

وہ کسی بھی مخلوق کے ساتھ پیش آتی تو اس میں ایک روحانی آہستگی، ایک لطیف مسکراہٹ، اور ذکرِ الٰہی کی معطر ہوا گھلی ہوتی تھی۔

—گھر کے عقب میں واقع باغ اس کی خاص محبوب جگہ تھی

جہاں درختوں کے سائے، صبح کی ہوا، اور پرندوں کی چہچہاہٹ ایک کامل عبادت کا منظر بن جاتے۔

وہاں سبز گھاس تھی، چند پرانے درخت، اور پرندوں کے پر پھڑ پھڑانے کی مسلسل موسیقی۔

اس کا معمول تھا کہ فوڈ اسٹور سے ہمیشہ تازہ ترین ڈبل روٹیاں خرید کر لاتی۔

پھر بڑی محبت سے انہیں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں توڑتی، باغ میں بکھیرتی،

جونہی روٹی زمین پر گرتی، آسمان سے جیسے **نور کے پروانے** اتر آتے۔

اور چند لمحے نہ گزرتے تھے کہ آسمان سے پرندوں کے غول اُسے گھیر لیتے۔

کبوتروں کے نرم پر، چہکتی چونچیں، اور ان کا محبت سے اس کے گرد بیٹھ جانا

کبوتروں کے غول اس طرح اس کے گرد بیٹھ جاتے

یوں لگتا جیسے کسی درویش کے گرد مرید جمع ہوں۔

جیسے کوئی ولی اللہ ان پر دستِ کرم پھیرنے والا ہو

اور عجیب بات یہ کہ وہ ڈرتے نہیں تھے۔

آناً فاناً اس کے ساتھ مانوس ہو جاتے۔ وہ ان سے **محبت بھرے لہجے** میں بات کرتی،

—اور وہ—ہاں، وہ پرندے

واقعی اس کی باتوں کا جواب دیتے محسوس ہوتے تھے۔

کبھی وہ اس کے کندھوں پر بیٹھ جاتے،
کبھی ہاتھوں پر آ بیٹھتے،
—اور کبھی اس کے کانوں میں سرگوشیوں کی طرح گنگناتے
جیسے کوئی مخفی راز سنا رہے ہوں۔
میں اکثر پوچھتا:
"کیا باتیں ہوتی ہیں تمہاری ان سے...؟"
وہ مسکرا کر پہلے مجھے عدم کا شعر سناتی،
میں تیرا رازداں بنتا تو ہوں اے ہم نشیں لیکن
سنا ہے رازدانوں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے
پھر اچانک مسکرا کر بات کو نیا رخ دیکر جواب دیتی:
یہ سب اللہ کی تسبیح کرتے رہتے ہیں،
میں تو بس ان کی نغمگی سنتی ہوں۔
پھر وہ درختوں کے پتے اٹھا کر ان کی جڑوں میں رکھتے ہوئے کہتی کہ جدائی کا عذاب بڑا مشکل ہوتا ہے،
خزاں میں اپنے پتوں کی ___ جُدائی کی اذیت کو
شجر محسُوس تو کرتا ہے ___ مگر کُچھ کر نہیں سکتا
پھر اچانک درخت کی ٹہنی کے زندہ پتوں کو بڑے نرم گداز طریقے سے تھام لیتی، دیر تک درود شریف پڑھتی۔
کہتی:
آپ غور کریں کہ کسی بھی ایک پتے کو ہاتھ میں تھام لیں تو گویا آپ نے درخت کے تمام پتوں کو تھام لیا کیونکہ یہ آپس میں اس قدر جڑے ہوئے ہیں کہ ایک دوسرے کا حوالہ بن گئے ہیں۔ قیامت کے دن یہ پتے گواہی دیں گے کاش ہم مسلمان اس راز کو جان سکیں:
اچانک انتہائی خوبصورتی سے موضوع تبدیل کرتے ہوئے مجھے بھی گواہ بنالیتی کہ میں نے ہر سانس کے ساتھ ﷺ پر درود پڑھا۔
اور یہ پرندے!
یہ بھی میری شہادت بنیں گے۔
یہ میرے ذکر کی خوشبو کے گواہ ہیں۔
میں انہیں بھی ساتھ ملا رہی ہوں۔
ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ دنیا میں کسی کو بھی میرے اس عمل کی خبر نہیں دیں گے اور اس طرح نفس ریاکاری سے محفوظ رہتا ہے۔
میری سمجھ میں نہ آتا، مگر دل کو ایک عجیب سی تسکین ملتی تھی۔

وہ دن — جس نے مجھے پہلی بار جھنجھوڑ دیا

ایک بار فوڈ اسٹور میں معمول کے مطابق دو دن پرانی آدھی قیمت والی ڈبل روٹیاں پڑی تھیں۔

میں نے سوچا:

پرندوں کی خوراک کیلئے یہی بہتر ہے، یہی اٹھا لیتے ہیں۔

جیسے ہی میں نے وہ آدھی قیمت والی روٹیاں ٹرالی میں ڈالیں،

ثمینہ نے حیرت اور ملال بھری نظر سے مجھے دیکھا۔

آواز ہلکی مگر چبھتی ہوئی تھی:

... آپ جیسے شاہ خرچ سے یہ امید نہیں تھی"

چند پنس بچانے کیلئے آپ یہ کریں گے

میں ان پرندوں کو وہی خوراک دوں گی

جو ہم اپنے لیے پسند کرتے ہیں۔

یہ اللہ کی مخلوق ہے

اور میں ان کیلئے کبھی کم تر چیز نہیں چن سکتی۔

اس کی بات میرے دل میں تیر کی طرح اتر گئی۔

—اس دن میں نے پہلی بار جانا کہ سخاوت صرف انسانوں کیلئے نہیں

دل کا ظرف ہر جاندار سے ظاہر ہوتا ہے

میری گردن جھک گئی۔

مجھے پہلی بار ندامت کا احساس ہوا

پرندوں کی وفا اور ایک ماں کی مہک

رمضان المبارک کی ستائیسویں شب...وہ رات جو خود تقدس کی خوشبو میں لپٹی آتی ہے۔ **آج بھی جب وہ بابرکت شب یاد آتی ہے، دل پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔** اسی رات، جمعرات کے مبارک لمحوں میں، ثمینہ سمیع نے اس دنیا کی تھکاوٹیں اتار کر ربِّ رحیم کی آغوش میں ہمیشہ کے لیے پناہ لے لی **وہ شب، جب ثمینہ سمیع — محبتوں، نرمیوں اور پرندوں تک سے انس رکھنے والی ایک پاکیزہ روح — اپنے رب کی بارگاہ میں لوٹ گئیں۔**

اگلے دن جمعتہ الوداع کی نورانی صبح ان کی نمازِ جنازہ ادا ہوئی — ایسا لگا جیسے وقت بھی احترام میں تھم گیا ہو۔ جیسے آسمان و زمین خود ان کے استقبال کے لیے لمحہ بہ لمحہ متبرک ہوتے جا رہے تھے۔ دن گزرتے گئے، مگر غم اپنی جگہ جما رہا۔

جمعرات کی رات ان کا وصال ہوا، اور اگلے دن جمعتہ الوداع کے عظیم اور نورانی دن ان کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔۔

لیکن اصل معجزہ تو اس کے بعد رونما ہوا۔

وصال کے تیسرے دن، میر ابیٹا فاتحہ پڑھنے قبرستان پہنچا، مگر اپنے ہی قدموں کے درمیان راستہ کھو بیٹھا۔ غم کی شدت نے اس کے قدموں سے راہ چھین لی۔ وسیع و عریض قبرستان میں ہر راستہ ایک جیسا لگنے لگا۔

وسیع قبرستان میں ہر سمت ایک جیسی لگ رہی تھی — خاموش، ساکت، اور غم میں ڈوبی ہوئی۔

وہ کھڑا تھا... آنکھوں میں نمی، دل میں بے بسی، اور سامنے ایک ایسا سکوت جو انسان کو اپنی ہی آواز سے اجنبی کر دیتا ہے۔

دل میں ایک ہی صدا تھی:

"امّی... میں آپ تک کیسے پہنچوں؟"

...اور پھر

...اور تب

قدرت نے اپنا ایک ایسا اشارہ دیا جو صرف دلوں میں جگہ رکھنے والی پاکیزہ روحوں کو نصیب ہوتا ہے۔

اچانک ایک پرندہ آسمان کی بلندیوں سے اڑتا ہوا اس کے قریب زمین پر اترا۔ جیسے کسی دکھ سے دوچار بچے کے سر پر ہاتھ رکھنے آیا ہو۔ نہ شور، نہ خوف... صرف نرم پروں کی ایک ہلکی سی سرسراہٹ۔

اس نے زمین پر ٹھہر کر بیٹے کی طرف دیکھا، جیسے کوئی پرانا رفیق مل گیا ہو۔ پھر وہ چند قدم آگے بڑھا... اور رُک کر پیچھے مڑ کر دوبارہ بیٹے کو دیکھنے لگا۔

گویا کہہ رہا ہو:

جیسے آواز دے رہا ہو:

"آؤ... میں تمہیں تمہاری ماں تک لے چلتا ہوں۔"

اور یوں وہ پرندہ راستہ بن گیا، راہبر بن گیا۔

میر ابیٹا اس کے پیچھے چلتا گیا، اور وہ ننھا سا مسافر خاموشی سے، نرمی سے، وفاداری سے اسے سیدھا ثمینہ کی قبر تک لے آیا — جیسے محبت خود راستہ بن کر سامنے کھڑی ہو گئی ہو۔ یہ منظر صرف دیکھا ہی نہیں گیا، بلکہ موبائل کیمرے نے بھی اسے قید کر لیا — وہ لمحہ، وہ منظر، وہ کیفیت..... کیمرے میں محفوظ ہو گئی۔ آنکھوں کے آنسوؤں، دل کی دھڑکنوں اور کپکپاتے لبوں پر لرزتی ہوئی کمنٹری کے ساتھ۔

آنکھوں میں نمی، دل میں ایک ماں کی مہک... ایک ایسا لمحہ، جو دیکھنے والوں کے دلوں کو چھو جائے... اور سننے والوں کی روح کو ہلا دے۔ سب کچھ ویڈیو میں سمٹ گیا۔

...اور پھر یہ ویڈیو

دوست کے ہاتھوں یوٹیوب تک جا پہنچی۔

اور پھر یہ منظر ہزاروں دلوں تک پہنچا—ہر دیکھنے والا احترام سے خاموش ہو جاتا، جیسے دل کے سامنے کوئی مقدس واقعہ گزر رہا ہو۔

اور ہر دیکھنے والا یہی سوچتا رہا کہ یہ کوئی عام اتفاق نہیں۔ یہ محبت کی وہ روشنی ہے جو کبھی بجھتی نہیں۔

کیونکہ ثمینہ.....

جو زندگی بھر پرندوں سے پیار کرتی رہیں، ان کے لیے دانہ ڈالتی رہیں، ان کے لیے جگہ بناتی رہیں

لگتا ہے، آج بھی وہ محبت بے زبان پروں میں زندہ ہے۔

کچھ محبتیں مٹی میں جا کر بھی ختم نہیں ہوتیں۔

ثمینہ نے زندگی بھر پرندوں سے محبت کی.....

اور پرندوں نے اس محبت کا قرض یوں چکایا کہ ایک بیٹے کی رہنمائی اس کی ماں تک پہنچا دی۔

وہ پرندے، جنہیں وہ ہمیشہ پیار سے بلایا کرتی تھیں، آج بھی اس محبت کا قرض چکا رہے ہیں—اپنی پرواز سے، اپنی سمت سے، اپنی خاموش رہنمائی سے۔

کچھ محبتیں وفاداری میں بدل کر زمین سے آسمان تک سفر کرتی ہیں۔

اور ثمینہ کی محبت بھی ایسی ہی محبت تھی۔

جو آج بھی پروں کی تھرتھراہٹ میں آپ کے بیٹے کی رہنمائی کر رہی ہے۔

وہ شب تھی نور کی، وہ دن تھا رحمتوں سے بھرپور

جب ثمینہ نے چھوڑ دی دنیا—لوٹ گئیں ربّ کی طرف دور

قبر پر جانے نکلا تھا بیٹا، دل میں درد کی آگ لیے

راستے سب دھندلا گئے تھے، قدموں میں بھیگے سوگ لیے

پھر اک پرندہ اترا جیسے، ماں کی سانسیں ساتھ لیے

زمین پر نکلا رہبر بن کر، آنکھوں میں کچھ بات لیے

چلتا جاتا، رُک رُک کر، جیسے پیغامِ شفقت ہو

"آؤ بیٹا، میں بھی چلتا ہوں، یہ ماں کی قبر کی رحمت ہو"

پَر پھڑکے تو لگتا تھا جیسے، ماں نے دل پر ہاتھ رکھا

دھوپ میں بھی اک سایہ اُترا، غم کے دل کا بوجھ ہَلکا ہوا

اے ثمینہ! تیری محبت نے آج بھی اپنا قرض نبھایا

تو نے جنہیں دانہ ڈال کے پالا، وہ آج بھی تیری یاد میں آیا

محبت وہ تھی جو پروں میں تھی، اور اب بھی اس میں روشنی
ماں کی مہک کبھی نہیں مٹتی — رہتی ہے زندگی بھر ساتھ ہی

ملاحظہ فرمائیں یوٹیوب پر اس کنج مخفف کو چھوئیں:

https://www.youtube.com/watch?v=qWBkQshpNEA

وفات کے بعد جو منظر شروع ہوا—وہ آج تک رک نہیں سکا

جب سے ثمینہ اس دنیا سے گئی ہے،
میں اُس کی قبر پر روز جاتا ہوں۔
شروع شروع میں جب بیٹھتا تھا
—تو قریب کے درختوں سے چند پرندے آ جاتے تھے
میں سمجھتا تھا اتفاق ہے۔
لیکن آہستہ آہستہ
یہ منظر "اتفاق" سے دو قدم آگے چلا گیا۔
اب تو **غول در غول پرندے**
جیسے اس کی قبر کا طواف کرتے ہیں۔
پہلے ایک آتا.....
پھر دوسرا.....
پھر اچانک پوری فضا پروں کی سائیں سائیں سے بھر جاتی۔
وہ نیچے آ کر قبر کے گرد گھومتے،
بیٹھتے،
—پھر آسمان کی طرف اڑتے
ایسے جیسے درود کی گونج لے کر لوٹ رہے ہوں۔

وفات کے بعد—وہ منظر جس نے پوری دنیا کو حیران کر دیا

شروع میں بس خاموشی ہوتی تھی۔
پھر ایک دن،
جب میں اس کی قبر پر بیٹھا تھا،
حسبِ معمول جب قبرستان پر پرندوں کا ہجوم پہلی بار اترا.....
ایک سفید کبوتر آ کر اس کی قبر کے سرہانے بیٹھ گیا۔
...اگلے دن دو آئے
...پھر تین
پھر جیسے پوری فضا اس قبر کے گرد جمع ہونے لگی۔

اب تو ہر روز

ہر وقت

ہر موسم میں

—پرندوں کے غول اس کی قبر پر اُترتے ہیں

یوں جیسے ابھی بھی وہ ان کے ہاتھوں پر بیٹھنے کیلئے بلاتی ہو۔

کبھی وہ قبر کے گرد چکر لگاتے،

کبھی سب ایک ساتھ بیٹھ جاتے،

— کبھی فضا میں پر مار کر دوبارہ نیچے آتے

ایک باقاعدہ طواف کی شکل میں۔

یہ کوئی معمولی منظر نہیں رہا۔

آج یہ پورے قبرستان کی پہچان بن چکا ہے۔

تو قریب بیٹھا ایک سفید کبوتر بالکل خاموشی سے

اس کی قبر کے سرہانے آکر بیٹھ گیا۔

پھر دوسرا.....

پھر تیسرا.....

اور کچھ ہی دنوں میں

پھر جیسے پوری فضا اس قبر کے گرد جمع ہونے لگی۔

—یہ ایک منظر نہیں

ایک نورانی دستور بن گیا۔

اب تو ہر روز

ہر وقت

ہر موسم میں

—پرندوں کے غول اس کی قبر پر اُترتے ہیں

یوں جیسے ابھی بھی وہ ان کے ہاتھوں پر بیٹھنے کیلئے بلاتی ہو۔

کبھی وہ قبر کے گرد چکر لگاتے،

کبھی سب ایک ساتھ بیٹھ جاتے،

— کبھی فضا میں پر مار کر دوبارہ نیچے آتے

ایک باقاعدہ طواف کی شکل میں۔

پورا آسمان جیسے اس کی قبر پر اپنا سایہ ڈالنے آ جاتا ہے۔
یہ کوئی معمولی منظر نہیں رہا۔
آج یہ پورے قبرستان کی پہچان بن چکا ہے۔
کبوتروں کو کسی انسان سے مانوس ہونے میں آخر کون سا راز چھپا ہے۔
کبوتروں کو کسی انسان سے یوں مانوس ہونے میں
آخر کون سا راز چھپا ہے۔

پہلے پہل ماں جی نے جب خود اپنی آنکھوں سے یہ مناظر دیکھے تو مجھے منع کیا:
بیٹا، کسی کو مت بتانا.....
لوگ کیا کیا باتیں بنائیں گے۔
مگر اب تو یہ راز چھپ ہی نہیں سکتا۔
پورا قبرستان جانتا ہے۔
لوگ آتے ہیں،
ٹھٹھک کر رک جاتے ہیں،
کیمروں میں تصویریں بناتے ہیں،
اور حیرانی سے پوچھتے ہیں:
یہ پرندے... صرف یہاں کیوں آتے ہیں؟"
"صرف اسی قبر پر کیوں جمع ہوتے ہیں؟
.....اور میں بس مسکرا کر کہتا ہوں
.....میں کیا بتاؤں"
انہی پرندوں سے پوچھ لو
کہ اس وسیع قبرستان میں، یہ میلہ ہر روز
"صرف ثمینہ کی قبر پر کیوں لگتا ہے؟
اس سوال کا جواب
نہ میں دے سکتا ہوں
—نہ دنیا دے سکتی ہے
شاید یہ جواب آسمان ہی جانتا ہے
اور پرندوں کے پروں میں چھپا کوئی راز۔

کیا یہ ثمینہ کی اُن کی زندگی بھر کی محبت کا جواب ہے؟
ایک دن ایک شخص نے مجھ سے پوچھا:
سر، آپ بتائیں... ایسا کیوں ہوتا ہے؟"
"کیا یہ اس خاتون کی زندگی کے کسی عمل کا نتیجہ ہے؟
اور آپ نے ہمیشہ کی طرح مسکرا کر کہا:
میں کیا بتاؤں؟"
... آپ خود ان پرندوں سے پوچھ لیں
—یہ جانتے ہیں
کہ اس وسیع قبرستان میں
"میلہ صرف اسی قبر پر کیوں لگتا ہے
لیکن حقیقت یہ ہے کہ
جو لوگ روح کی باریکیوں کو سمجھتے ہیں
وہ جانتے ہیں کہ محبت کبھی مرتی نہیں۔
ثواب کبھی ختم نہیں ہوتا۔
اور نیکی کبھی دفن نہیں ہوتی۔
وہ پرندے آج بھی
ثمینہ کی قبر پر یوں بیٹھتے ہیں
جیسے اس دنیا میں اس کے ہاتھوں سے خوراک کھاتے تھے۔
یوں اترتے ہیں جیسے اُس کی آواز اب بھی انہیں بلاتی ہو۔
یوں اس کی قبر کا طواف کرتے ہیں جیسے
وہ ابھی بھی ان کے دلوں میں زندہ ہے۔
میری سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آتا، مگر دل کو ایک عجیب سی تسکین کے ساتھ ثمینہ کی ان یادوں کو تقویت مل جاتی ہے۔

پرندوں کی وفا—کیا یہ صرف اتفاق ہے یا کسی نورانی نسبت کا تسلسل؟

غیر مسلم زائرین کی حیرت—اور نئے القابات

اب تو ہر دن،

ہر وقت،

ہر موسم میں،

پورا آسمان جیسے اس کی قبر پر اپنا سایہ ڈالنے آ جاتا ہے۔

مگر یہ راز اب کب چھپ سکتا تھا؟

اب تو قبرستان آنے والا ہر شخص رک جاتا ہے۔

تصویریں بناتا ہے۔

ویڈیوز بناتا ہے۔

حیرت سے سر ہلاتا ہے۔

ایک انگریز خاتون نے روتے ہوئے کہا:

"I have never seen birds loving someone after death…"

ایک انگریز بزرگ نے سر جھکا کر کہا:

"This woman must be beyond ordinary… Even nature remembers her."

ایک انگریز خاتون تو حیرت سے بولی:

"I've never seen anything like this in my entire life…

Why do they only gather on *her* grave?"

اور ایک نوجوان لڑکی نے تو محبت میں اسے لقب دے دیا:

"The Lady of Birds"

پھر ایک اور:

"The Saint of Doves"

کوئی کہتا ہے:

"Bird-Mother"

کوئی کہتا ہے:

"Angel of this graveyard.

اور پھر لوگوں نے

ثمینہ کو محبت بھرے القابات سے یاد کرنا شروع کر دیا:

جب لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں:

"Sir, why only her grave?

Why do birds gather here every day?"

میں ہمیشہ مسکرا کر ایک ہی جواب دیتا ہوں

میں کیا بتاؤں.....

—انہی پرندوں سے پوچھ لو

غیر مسلم لوگ،

جو قبروں پر عموماً خاموشی سے گزرتے ہیں،

اب یوں رُک جاتے ہیں

جیسے کسی روحانی مظاہرہ کے سامنے کھڑے ہوں۔

اور حیرت کی بات یہ ہے

یہ سب غیر مسلموں کے الفاظ ہیں۔

وہ نہ ثواب سمجھتے ہیں،

نہ ذکر کی حقیقت،

وہ نہ درود شریف کی حقیقت جانتے ہیں،

نہ ثوابِ صدقہ جاریہ،

—نہ نیکی کی وہ لطیف روحانی تاثیر

مگر پھر بھی کچھ ان کے دلوں کو بے اختیار کھینچ رہا ہے۔

— پھر بھی کچھ ہے

جو ثمینہ کی قبر سے پھوٹتا ہے،

اور سیدھا دل تک اتر جاتا ہے۔

اس وسیع قبرستان میں، یہ میلہ ہر روز

صرف ثمینہ کی قبر پر ہی کیوں لگتا ہے؟

—اور شاید

شاید پرندوں کے پاس ہی اس کا جواب ہے۔

وہ جواب، جو انسانوں کی سمجھ سے باہر ہے،

مگر روح اس کی خوشبو پہچان لیتی ہے۔

بیٹی کی آمد—امید کی روشنی

ایک دن، مسافرِ حدیث کے دروازے پر ایک بیٹی کھڑی ہوئی:
ڈاکٹر، استاد، دانشور، اور دل کی روشنی کی مسافر
جو بولی:
میں آپ کی تحریروں کی مسافر ہوں۔
میری رہنمائی کریں.....
مسافرِ حدیث نے پہلے تو چند لمحے خاموشی اختیار کی،
پھر دل میں ایک عجیب سکون محسوس کیا۔
یہ سکون
یقین اور امید کی نئی کرن تھی۔
بیٹی کی آنکھوں میں وہی روشنی تھی
جو کبھی ثمینہ کی آنکھوں میں تھی۔

روحانی مکالمہ—امید کا پیغام
مسافرِ حدیث نے بیٹی سے کہا:
یہ کتابیں، یہ تحریریں،
اور یہ روحانی روشنی تمہارے لیے ہے۔
اگر تم نے دل سے پڑھا
تو تمہیں ہر لفظ میں ثمینہ کی دعا،
ہر سطر میں صبر،
اور ہر صفحے میں عشقِ رسول ﷺ کی جھلک ملے گی۔
بیٹی نے سر جھکایا اور خاموشی سے دعا کی:
یارب!
ہمیں اسی روشنی کی رہنمائی دے
جو ہمارے بزرگوں کے دلوں میں تھی۔

خلا کی چپ میں ایک نیا سورج اُبھر آیا
بیٹی کی آنکھوں میں ثمینہ کی روشنی نظر آئی

تحریروں کے ہر لفظ میں
حدیثِ صبر، حدیثِ قلم، حدیثِ محبت، حدیثِ عشق ﷺ چھپی،
ستر کے قریب حدیثِ کتب احباب کی نگاہوں کو شرف بخشنے کیلئے منظر پر آ گئیں،
بیٹی نے ایک عجیب مطالبہ کر کے مجھے کھلے میدان میں نہتا کر دیا کہ
ان تمام کتب سے کوئی تین کتابوں کا انتخاب کیا ہو گا؟
جواب ندارد۔۔۔ گنگ ہو گیا لیکن
اب امید کی نئی کرن
مسافرِ حدیث کی زندگی میں روشن ہوئی

حدیثِ وارثت — علم و روحانیت کی نئی کرن
مسافرِ حدیث نے محسوس کیا کہ بیٹی کی آمد
صرف ایک اتفاق نہیں بلکہ
اللہ کی مرضی سے
ایک نئی روشنی کی تجلی تھی۔
اب وہ بیٹی جو ڈاکٹر، استاد، اور دانشور تھی،
اس کے سامنے وہ اپنی زندگی کے 70 کتابوں کے خزانے کھول سکتا تھا۔

بیٹی کو تحریروں کی رہنمائی

ایک دن مسافرِ حدیث نے بیٹی سے کہا:
یہ کتابیں، یہ تمام تحریریں، میرے رب کی توفیق سے لکھی گئی ہیں۔
میں ہر کتاب کو برابر مانتا ہوں، کوئی چھوٹا، کوئی بڑا نہیں۔
لیکن چند مضامین تمہارے لیے
روشنی کی مانند ہو سکتے ہیں۔
ان کو پڑھو، اور دل کی زبان سے سمجھو۔
بیٹی نے خاموشی سے سر ہلایا،
اور دل میں یہ وعدہ کیا کہ وہ
اس علم اور روحانی روشنی کو آگے بڑھائے گی۔

روحانی مکالمہ — دل کی تعلیم

مسافرِ حدیث نے مزید کہا:
جب تم یہ تحریریں پڑھو گی،
تمہیں ہر لفظ میں ثمینہ کی دعا،
ہر صفحے میں عشقِ رسول ﷺ کی سرشاری،
اور ہر سطر میں صبر اور تحمل کی طاقت نظر آئے گی۔
بیٹی نے سر جھکایا اور دل سے کہا:
میں یہ سب قبول کرتی ہوں،"
اور اپنی زندگی میں
ان کی روشنی کو زندہ رکھوں گی۔
حدیثِ وارثت — علم اور نور کی منتقلی
اس دن سے
مسافرِ حدیث کی زندگی میں
ایک نیا مقصد پیدا ہوا:
اپنی تحریروں کی روشنی
ثمینہ سمیع کی عبادت اور صبر
عشقِ نبوی ﷺ کی سرشاری
یہ سب کچھ اب
بیٹی کے ذریعے نئی نسل تک پہنچایا جائے گا۔
یہ ایک روحانی وارثت تھی،
جو محض علم کا نہیں بلکہ
دل کی روشنی، صبر، اور محبت کا پیغام تھی۔

اب کتابوں کے ہر لفظ میں
ثمینہ کی دعا چھپی ہے
مسافرِ حدیث کی روح کی روشنی
بیٹی کی آنکھوں میں جل رہی ہے

حدیثِ وارثت،
علم و محبت کی نگری،
اور عشقِ رسول ﷺ کی سرشاری
اب ایک نئی نسل کے دلوں میں زندہ ہے

حدیثِ تقدیر و عروج — تحریروں کا عالمی منظر اور فلسفۂ زندگی

مسافرِ حدیث نے محسوس کیا کہ اس کی زندگی کے سارے زخم، صبر، اور روشنی
اب دنیا کے سامنے اپنی جگہ بنانے لگے ہیں۔
اس کے قلم سے نکلنے والی ہر تحریر
صرف ایک کاغذ کا ٹکڑا نہیں،
بلکہ ایک حدیثِ نور تھی،
جو دنیا کے ہر کونے میں پہنچ سکتی تھی۔

تحریروں کا عالمی منظر

دنیا کے مختلف ممالک میں اس کی کتابیں پہنچیں،
اور ہر کتاب میں ایک ہی بات چھپی تھی:
ظلم اور جبر کے خلاف آواز بلند کرنا
صبر اور تحمل کی روشنی
عشقِ نبوی ﷺ اور رب کی محبت
زندگی کے ہر لمحے میں عبادت اور خدمت
مسافرِ حدیث نے محسوس کیا کہ
تحریروں کے ذریعے
ثمینہ سمیع کی روشنی، ان کی دعائیں، اور ان کا صبر
اب دنیا کے دلوں کو چھو رہی ہیں۔

روحانی مکالمہ — فلسفۂ زندگی

ایک دن، وہ اپنے دفتر میں بیٹھ کر سوچ رہا تھا:
کیا میں نے یہ سب کچھ اپنے لیے کیا؟"
یا یہ سب کچھ اللہ کی رضا اور لوگوں کی رہنمائی کے لیے تھا؟
کیا یہ تحریریں صرف کتابوں میں محفوظ رہیں گی
یا دلوں کو بھی روشن کریں گی؟
اس لمحے، چشمِ تصور میں، بیٹی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا
اب یہ سب زندگی کی روشنی ہے۔
ہماری ذمہ داری ہے کہ اسے دلوں میں بھی منتقل کریں۔
یہ صرف کاغذ نہیں، یہ ہر انسان کے دل کا نور ہے۔

حدیثِ فلسفہ — زندگی کی بصیرت

مسافرِ حدیث نے لکھا:
زندگی کا مقصد صرف بقا نہیں
یہ ہر لمحے کو اللہ کی رضا اور محبت کے ساتھ گزارنا ہے
ہر مصیبت، ہر صبر، ہر دعا
اور ہر محبت، انسان کی روح کو روشن کرتی ہے
یہ فلسفہ،
جو چھ سال کے امتحان، ثمینہ کی عبادت، اور تحریروں کے تجربے سے پیدا ہوا،
اب دنیا کے سامنے ایک روشنی کی صورت اختیار کر گیا۔

کتابوں کے ہر لفظ میں
عالمی روشنی چھپی ہے
ثمینہ کی دعا، صبر اور عشق ﷺ
اب ہر دل کے لیے ایک چراغ ہے
یہ تحریر، یہ فلسفہ،
زندگی کی حقیقت،
اور انسانیت کا سبق
اب دنیا کے ہر گوشے میں روشنی کر رہا ہے

حدیثِ نجات — آخری فکر اور زندگی کا حتمی پیغام

زندگی کے اختتام پر، مسافرِ حدیث نے محسوس کیا کہ ہر لمحہ، ہر درد، ہر صبر، اور ہر دعا، ایک ہی مقصد کے لیے تھی:
اللہ کی رضا اور عشقِ رسول ﷺ کی سرشاری۔
اس نے قلم اٹھایا اور بالآخر گزشتہ آٹھ سال سے منتظر اپنی تحریر لکھنا شروع کی:
زندگی صرف بقا کی خاطر نہیں،
یہ ہر لمحے کو اللہ کی رضا اور محبت میں گزارنے کا نام ہے۔
ہر صبر، ہر محبت، ہر عبادت
انسان کو روشنی اور نجات کی طرف لے جاتی ہے۔
یہی وہ حدیث ہے جو میں نے اپنی زندگی میں جیا۔
اور یہی وہ سبق ہے جو میں بیٹی اور آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑنا چاہتا ہوں۔

روحانی مکالمہ — دل کی جمع بندی

مسافرِ حدیث نے بیٹی سے کہا:
یہ تمام سبق، یہ تمام تحریریں"
صرف کتابوں میں نہیں،
بلکہ دلوں میں بھی زندہ رہنی چاہئیں۔
ثمینہ کی دعا، صبر، اور عشقِ رسول ﷺ
ہر انسان کے دل میں روشنی پیدا کر سکتا ہے۔
بیٹی نے خاموشی سے سر ہلایا اور دل سے دعا کی:
یارب!
ہمیں اسی روشنی کی رہنمائی دے
جو ہمارے بزرگوں کے دلوں میں تھی۔
ہم بھی اپنی زندگی میں اسی روشنی کو زندہ رکھیں۔

حدیثِ نجات — زندگی کا فلسفہ

مسافرِ حدیث نے اپنے دل میں محسوس کیا:
زندگی کا سب سے بڑا مقصد صبر، محبت، اور عبادت ہے
ہر دکھ اور ہر مصیبت
انسان کو روحانی طور پر مضبوط بناتی ہے

عشقِ رسول ﷺ، خوفِ خدا، اور خدمتِ خلق
انسان کی زندگی کو مکمل اور روشنی سے بھر دیتا ہے
یہ فلسفہ، جو چھ سالہ صبر، ثمینہ کی عبادت، اور تحریروں کے تجربے سے پیدا ہوا،
اب ہر انسان کے لیے ایک روشنی کی راہ بن چکا تھا۔

زندگی کا ہر لمحہ عبادت
ہر صبر، ہر دعا، ہر لمحہ نور
ثمینہ کی محبت، عشقِ رسول ﷺ
اور قلم کی روشنی
اب ہر دل کے لیے چراغ ہے
یہ حدیثِ نجات،
زندگی کا فلسفہ،
اور انسانیت کا پیغام
ہمیشہ زندہ رہے گا

حدیثِ روشنی — اختتام و مستقبل کی امید

دنیا کے افق پر سورج کی نرم کرنیں پھیل رہی تھیں،
اور گھر کے ہر گوشے میں پھر سے سکون چھا گیا تھا۔
مسافرِ حدیث نے محسوس کیا کہ
ثمینہ سمیع کی محبت اور صبر کی روشنی
اب صرف اس کے دل میں نہیں،
بلکہ بیٹی کے دل میں بھی زندہ ہے۔
یہ روشنی
اب آنے والی نسلوں کے لیے ایک راستہ بن چکی تھی۔

بیٹی — علم و نور کی وارث

بیٹی نے پہلی بار اپنی آنکھوں میں وہ روشنی محسوس کی جو کبھی ثمینہ کی آنکھوں میں تھی۔
اس نے کہا:
میں اب یہ تحریریں، یہ علم، اور یہ روشنی،
دنیا کے ہر دل تک پہنچاؤں گی۔
یہ صرف کتابیں نہیں، یہ زندگی کی حقیقت،
ہر انسان کے دل کی ہدایت ہیں۔
مسافرِ حدیث نے دل سے جواب دیا:
تم اسی روشنی کی وارث ہو،
اور تمہارے ذریعے
ثمینہ کی دعا، عشقِ رسول ﷺ، اور صبر کی حدیث
ہر دل تک پہنچے گی۔

روحانی مکالمہ — امید کی کرن

مسافرِ حدیث نے اپنے دل کی بات بیٹی سے کہی
یہ زندگی، یہ مصائب، یہ صبر
سب ایک مقصد کے لیے تھے:

اللہ کی رضا، عشقِ رسول ﷺ، اور انسانیت کی خدمت۔
اب تمہارے ذریعے یہ مقصد نئے حیات پائے گا۔
بیٹی نے سر ہلایا اور دل میں یہ دعا کی:
یارب!
ہمیں اس روشنی کو برقرار رکھنے کی توفیق دے
ہم بھی اپنی زندگی میں
حدیثِ روشنی کی روشنی پیدا کریں۔

روشنی کا سفر ختم نہیں ہوا
ثمینہ کی دعا، بیٹی کی امید، اور مسافرِ حدیث کی تحریر
اب ہر دل میں چراغ بن گئے ہیں
یہ حدیثِ روشنی،
حدیثِ محبت،
حدیثِ صبر
اب ہر انسان کے لیے روشنی کی کرن ہے
اور یہ کرن
دنیا کی ہر تاریکی کو مٹا سکتی ہے۔

ــــاور آخر میں

رب نے اسے رخصت بھی کیسے کیا؟

جب ایک پاک روح رخصت ہوتی ہے اور آسمان اپنے دروازے کھول دیتا ہے.....

ثمینہ کی رخصت میرے لئے قیامت تھی،

ــــلیکن اس کی رحلت کا انداز خود یقینی کا درس تھا

ایک ایسی خاتون کہ جس نے زندگی قرآن کے نور میں گزاری،

ــــرب نے اسے دنیا سے رخصت بھی اسی نور کی سب سے روشن رات میں کیا

دنیا کی سب سے پاکیزہ رات:

رمضان المبارک.....شبِ قدر۔ 27

وہ رات جس میں فرشتے اترتے ہیں،

جس میں تقدیریں لکھی جاتی ہیں،

جس میں آسمان کے دروازے پوری طرح کھل جاتے ہیں۔

ــــاور اسی رات اس کا نام وہاں تحریر ہوا

ثمینہ سمیع، میری بندگی میں سرخرو،

میرے پاس لوٹ آؤ.....

اور نمازِ جنازہ.....

جمعۃ الوداع

جس میں اس کی نمازِ جنازہ ادا ہوئی۔

کیا اتفاق.....؟

یا کیا کرم.....؟

یا کیا قبولیت.....؟

اک دنیا سمٹ کر جنازہ میں شام ہو گئی

کوئی اعلان نہیں ہوا، کسی کو اطلاع نہیں دی گئی،

ایسے ایسے نورانی چہروں کی زیارت ہوئی جن پر نظر نہیں ٹھہر رہی تھی

سب ہی کندھا دینے کیلئے قطار اندر قطار

گاڑی میں جسدِ خاکی اپنی منزل کی طرف رواں دواں

لندن کی شاہراہوں نے جیسے ایسا منظر پہلے کبھی نہ دیکھا ہو

جب اس کی لحد اتاری گئی تو فضا میں وہ باریک، شفاف،
تو مہکی ہوئی بارش برسنے لگی، وہ بھیگی ہوئی دعاؤں جیسی خوشبو.....
—وہ بارش زمین پر نہیں
دلوں پر گر رہی تھی۔
جیسے رحمت کہہ رہی ہو:
شائد آسمان خد کہہ رہا تھا:
ثمینہ !خوش آمدید.....مرحبا، مرحبا
ثمینہ !یہ راستہ بھیگتا ہوا تیرے لئے سجایا گیا ہے۔
اور شاید اسی لئے
میں نے اپنی برسوں کی جھجک،
اپنی مشرقی حیا کی دیوار،
—اپنی کمزوری اور گریۂ دل
سب کو ایک طرف رکھ کر
یہ تحریر لکھ دی ہے۔
کیونکہ سچ چھپایا نہیں جاتا۔
اور اس کی پاکیزگی، اس کی وفاداری،
—اس کی عبادت گزاری
یہ سب سچ تھے جنہیں زمانہ جاننے کا حق رکھتا ہے۔
—آج اس تحریر کے اختتام پر میں جانتا ہوں
کہ میں نے اپنے دل کا قرض اتار دیا ہے۔
میں نے ثمینہ کی زندگی، کردار، نیکی اور نور کو
الفاظ کی شکل میں دنیا کے سامنے رکھ دیا ہے۔

آج جب میں یہ اختتامیہ لکھ رہا ہوں تو دل مطمئن ہے کہ
اللہ نے مجھے ہمت دی،
میں نے سچ کو لکھ دیا،
—اور شاید اب یہ تحریر صرف میری نہیں
بلکہ اُن سب کیلئے روشنی بنے گی جو گھروں میں خاموشی سے نیکیاں سمیٹے رہتے ہیں۔

یہ مضمون، یہ کتاب.....

—ثمینہ کی پاکیزگی، قرآن سے محبت، اور سچائی کا امانت ہے

اور میں نے اسے پوری ذمہ داری سے ادا کیا ہے۔

—یا اللہ! ثمینہ سمیع کی مغفرت فرما، اس کی قبر کو جنت کا باغ بنا، اور مجھے اس سے جنت میں دوبارہ ملادے

اسی محبت کے ساتھ،

اسی تعلق کے ساتھ،

اسی سعادت کے ساتھ۔

اور اب دعا کرتا ہوں:

یا اللہ!

ثمینہ سمیع کو اپنے قرب میں وہ مقام عطا فرما

جو تیرے پاکیزہ بندوں کیلئے ہے۔

اس کی قبر کو جنت کا باغ بنا،

اس کی روح کو سدا کے نور میں رکھ،

—اور جب میرا وقت آئے

تو مجھے اس سے ملادے۔

اسی محبت کے ساتھ،

اسی امانت کے ساتھ،

اسی نصیب کے ساتھ۔

یا اللہ...! اس پوری کتاب کو جو تیری دی ہوئی توفیق سے لکھی ہے، اسے ایک **دعائیہ سانس، ایک نعتیہ روشنی، اور ایک روحانی تحفہ** کی صورت میں قبول فرما اور یہ دعا روشنی بن کر قاری کے دل تک اتر جائے۔

اے اللہ!

جس نے دلوں میں محبت رکھی،

روحوں میں نور رکھا،

—اور وفاؤں کو اپنی رحمت کی شعاع بنادیا

ہم تیرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔

یارب!

ثمینہ سمیع کی پاکیزگی کو، اس کی خاموش عبادت کو،

اس کے قرآن سے عشق کو، اس کے صبر و حیا کو
اپنی بارگاہِ رحمٰن میں قبول فرما۔
اس کی قبر کو
ان انبیاء و صالحین کی قبروں کی طرح
نور سے بھر دے جنہیں تو نے پسند فرمایا۔
اس کی روح کو
—آسمان کے سب سے روشن حصے میں جگہ دے
جہاں کوئی خوف نہیں،
کوئی غم نہیں،
کوئی جدائی نہیں۔

یا اللہ!

جب ہماری آنکھیں بند ہوں،
ہماری سانسیں رک جائیں،
—اور ہمارے اعمال ہمیں دیکھ رہے ہوں
تو ہمیں اس مقام پر لے آ
جہاں پھر کبھی جدائی نہ ہو،
جہاں محبت تیری امان میں ہو،
جہاں ثمینہ سمیع مسکرا رہی ہو۔

یا الٰہی!

اس کتاب کو صدقۂ جاریہ بنا دے،
ہر لفظ کو نور کی کرن بنا دے،
ہر قاری کے دل میں ایمان کی حرارت پیدا کر دے،
اور اسے ثمینہ سمیع کی نیکیوں کا حصہ بنا دے۔
آمین۔۔۔ ثم آمین یا رب العالمین۔

اے میرے آقا ﷺ
آپ وہ چراغ ہیں جن کی روشنی سے یہ دل زندہ ہوئے،
آپ وہ محبت ہیں جس کے صدقے یہ روحیں نرم ہوئیں،

آپ وہ رحمت ہیں جس نے ہمارے دکھوں کو عبادت میں بدل دیا۔

—ثمینہ سمیع انہی درود و سلام کی خوشبو میں پل کر جوان ہوئی

اس کی آنکھوں میں وہی نور تھا

جو آپ ﷺ کے تذکرے سے آتا ہے۔

وہ قرآن پڑھتے ہوئے

آپ ﷺ کی سنتوں کے سایے میں رہتی تھی،

اور سجدے میں ہر دعا

آپ ﷺ کی محبت سے مہکی ہوتی تھی۔

وہ ہر بار کہتی تھی:

اے رب کریم اور رحمتہ العالمین ﷺ.....

میری آرزو ہے کہ آخرت میں مجھے سیدۃ النساء العالمین حضرت فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کی کنیز ہونے کا شرف نصیب ہو۔

میرے پروردگار!

اس کی یہ دعا قبول فرمائیں،

اس کی خاموش نیکیوں کو اپنی امت کی رحمت میں شامل کر کے

اس کے درجات بلند فرمائیں۔

یاربّ العزّت.....

اے وہ رب جو دلوں کے ٹوٹنے میں بھی رحمت رکھتا ہے،

جو یاد کے زخموں میں بھی اپنی روشنی بھر دیتا ہے۔

میں تیرے حضور جھکے ہوئے دل کے ساتھ عرض کرتا ہوں:

اے میرے کریم رب!

ثمینہ سمیع کی وہ بندگی جو تیری رضا کیلئے تھی،

وہ حیا جو تیرے خوف سے تھی،

—وہ محبت جو تیرے محبوب ﷺ کی سنت سے تھی

اُسے اپنی بہترین قبولیت عطا فرما۔

اس کی قبر پر اپنی رحمت کے وہ پردے اتار

جو فرشتوں کے پروں کی نرمی جیسے ہوں،

جو نور کے خزانے جیسے ہوں۔

اے مالکِ کائنات!

اس کی روح کو

ان روحوں کے قافلے میں شامل فرما

جن کے چہرے قیامت کے دن

چاند کی طرح چمکیں گے۔

اے میرے رحیم رب!

اس کے ہر نیک عمل

اس کے ہر مخفی صدقے

اس کے ہر معاف کر دینے

اور اس کے ہر خلوصِ دل والے سجدے کو

ایسے قبول فرما جیسے تُو اپنے محبوب بندوں کے اعمال قبول کرتا ہے۔

یا الرحمن و الرحیم!

جب میں اس دنیا سے آؤں

—تو ثمینہ کو میری پیشوائی کیلئے بھیج دینا

کہ یہ دل اب اس جدائی کی تپش کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔

اے دلوں کو جوڑنے والے سمیع العلیم!

اس تحریر کو،

ان لفظوں کو،

ان آنسوؤں کو

—اس کے نام کا صدقۂ جاریہ بنا دے

آمین یارب العالمین۔

یا مجیب الدعوات:

میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے ثمینہ کو ہمیشہ عشقِ رسول ﷺ کی خوشبو میں ڈوبا ہوا دیکھا—پردہ نشین عقیدت کی طرح، نرم اور روشن۔

یارسول اللہ ﷺ!

ثمینہ سمیع نے زندگی کی سانس سانس

آپ ﷺ کی یاد میں گزاری۔

جب بھی قرآن کھولتی،

اس کی انگلیاں آیتوں کی ٹھنڈک کے ساتھ
آپ ﷺ کی سنتوں کی خوشبو محسوس کرتیں۔
وہ کہتی تھی:
میری سب سے بڑی آرزو یہ ہے
کہ آخرت میں
سیدۃ النسا فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا
کی قدم بوسی نصیب ہو جائے..... مجھے ان کی کنیز ہونے کا شرف عطا کیا جائے!
—اور یہ آرزو اس کیلئے صرف خواہش نہ تھی
یہ اس کا عشق تھا،
اس کا ایمان تھا،
اس کا سب سے قیمتی خواب تھا۔

اے ساری دنیا کے پالنہار!
اپنی رحمت کی نظر
اس باحیا، باوفا،
قرآن سے وابستہ بندہ مؤمنہ پر فرمائیں،
اور اس کی روح کو
ان خواتینِ جنت کے زُمرے میں جگہ دیں
جو آپ کے قدموں کے آس پاس ٹھہرائی جائیں۔
جب دعا بھی روتی ہو، اور شاید فرشتے بھی سن رہے ہوں.....

یا ربّ العالمین.....
اے دلوں کے سوز سے واقف رب،
اے گمشدہ دلوں کے سہارے،
اے وہ ہستی جس کی بارگاہ میں نہ لفظوں کی کمی کوئی کمی بنتی ہے
—اور نہ آنسوؤں کی خاموشی کوئی پردہ رکھتی ہے
میں تیرے حضور اپنی کمزور ہتھیلیاں پھیلاتا ہوں۔
میرے پیارے آقا ﷺ کے محبوب رب!
جب ثمینہ نے زندگی گزاری
تو تیرے خوف اور تیرے عشق میں گزاری،

جب بولی تو حیا کی مٹھاس کے ساتھ،
جب چلی تو عبادت کی کرنوں میں لپٹی ہوئی،
جب مسکرائی تو ایمان کے نور سے جگمگاتی ہوئی۔

یارب!

اس کی زندگی ایک سجدہ تھی،
اس کی موت ایک قبولیت تھی،
اور اس کی یاد ایک مسلسل دعا ہے
جو آج بھی میرا سینہ گرم رکھتی ہے۔

یا غفور الرحیم!

اس کی قبر کو
بہشتی برف کی طرح ٹھنڈی،
بہار کی گھاس کی طرح نرم،
اور شبِ قدر کے آسمان کی طرح روشن کر دے۔
اس کے اعمالِ صالحہ کے بدلے
ایسا مقام عطا کر
کہ جب وہ پلِ صراط سے گزرے
تو فرشتے اس کا استقبال
بالکل ایسے کریں جیسے
صبحِ صادق سورج کی کرنوں کا استقبال کرتی ہے۔

یامالکِ روزِ جزا!

اس کے ہر نیک عمل کو
—کتابِ حیات میں نور کے حروف سے لکھ
وہ الفاظ بن جائیں
جو قیامت کے دن میرے رب کی مسکراہٹ کا سبب بنیں۔

یااللہ!

اس کے برتنوں میں کبھی دنیا کی آلائش نہ تھی،
اس کے دل میں کبھی کسی کے لئے بغض نہ تھا،

اس کی زبان کسی کو زخمی نہیں کرتی تھی،
—اور اس کے ہاتھ کسی مانگنے والے کے سامنے کبھی خالی نہیں رہتے تھے

یارب!

ایسی روحوں کا وعدہ تیرے فضل میں محفوظ ہے۔

اے رب!

—ایک التجا اور ہے
جب میرا وقت آئے
اور میری سانسیں میرے قلم کی طرح رکنے لگیں،
تو مجھے ثمینہ کی قبر کے پاس لے جانا،
یا کم از کم اس کی روح کے قریب،
تاکہ میری جدائی بھی ختم ہو
اور اس کی دعا بھی پوری ہو۔

یامقلب القلوب.....!

ہم دونوں کو اس مقام پر ملا
جہاں نہ کوئی رونا ہو،
نہ کوئی خوف،
—نہ کوئی حساب
—صرف تیرا جمال، تیرا نور، اور تیرا قرب
آمین یارب العالمین۔

میری پیاری بیٹی قندیل بدر،

جب میں نے ثمینہ کی یاد میں یہ تمام تحریر لکھی، یہ سوانح مرتب کی، اور اپنی زندگی کی روشنی کو کاغذ پر اتارا، میرا دل تمہاری جانب جھک گیا، کیونکہ میں گزشتہ آٹھ برسوں تک جب بھی ثمینہ کے لئے لکھنے بیٹھا تو میرا دماغ ان ہزاروں لمحات کے کچے دھاگوں میں الجھ جاتا تھا کہ مجھ سے اس کا سرا ڈھونڈنا بھی مشکل ہو جاتا تھا لیکن جب تمہیں خط لکھنے بیٹھا تو دل سے جہاں ہوک اٹھی وہیں قلم نے مسکراتے ہوئے ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا۔ یہ اس لئے ممکن ہوا کہ جانتا ہوں کہ یہ نور تمہارے ہاتھوں میں ایک چراغ بن کر **دنیا کی ظلمتوں میں روشنی** پھیلا سکتا ہے۔ میں یہ تمام تحریریں، یہ سوانح اور یہ روشنی تمہارے حوالے کر رہا ہوں، اس لیے کہ تم میرے رب کی دی ہوئی اس نعمت کی وارث ہو۔

بیٹی قندیل،

تم اپنے نام کی نسبت سے **اسم با مسمیٰ کی شان کے مطابق،** اس روشنی کو دنیا میں پھیلاؤ، تاکہ تمہارے ذریعے یہ چراغ ایک **نورانی روزنی** بن سکے۔ یہ نور صرف کاغذ یا کتابوں میں نہیں، بلکہ دنیا کی مظلوم، مجبور، اور مقہور قوموں کے دلوں میں امید، سکون، اور محبت پیدا کرے۔ ان کے دلوں میں امید، امن، اور سکون کی روشنی پیدا کرے، اور دنیا کے ہر گوشے میں محبت کے پھول کھل جائیں۔ یاد رکھو کہ یہ کتابیں، یہ تحریریں، یہ روشنی، صرف کاغذ یا لفظ نہیں ہیں، یہ ایک **روحانی پیغام** ہیں، ایک **حدیثِ نور**، جو تمہارے ذریعے زندہ رہ سکتی ہے۔

بیٹی، یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم یہ نور دنیا میں پھیلاؤ، یہ چراغ ہر دل کو روشن کرے، اور دنیا کو ایک **جنت کا نمونہ** بناؤ، جہاں ظلم، جبر، اور ناانصافی کا کوئی سایہ نہ ہو، اور ہر انسان محبت اور سکون کی زندگی گزار سکے۔ تمہاری زندگی، تمہاری دعا، اور تمہارا علم، ان لوگوں کے لیے امن، سلامتی، اور خوشی کی راہ ہموار کرے، اور یہ دنیا ایک **جنت کا نمونہ** بن جائے۔

بیٹی قندیل،

یاد رکھو کہ یہ روشنی تمہاری ذمہ داری ہے، یہ چراغ تمہارے ہاتھوں میں ہے، اور تم اس کے ذریعے دنیا کے ہر گوشے میں محبت اور امید پہنچا سکتی ہو۔ میری دعا ہے کہ اللہ تمہیں اس نور کو پھیلانے کی توفیق دے، تمہارے ہر قدم میں روشنی ہو، اور تم ہمیشہ اس چراغ کے مشعل کی مانند زندہ رہو۔ میری یہ بھی دعا ہے کہ اللہ تمہیں اس نور کو پھیلانے کی طاقت دے، اور تم ہمیشہ **روشنی کے مشعل کے طور پر زندہ رہو۔**

سب زِیر زَبر و شد و مد......................قُلْ هُوَ ٱللَّهُ أَحَد

لاریب لاہوتی عدد...................... قُلْ هُوَ ٱللَّهُ أَحَد

عجلتِ اَیام میں کُن کی صدا گونجی تھی یوں جاری

ہوا یہ اِک ورد ....قُلْ هُوَ ٱللَّهُ أَحَد

توں جمالِ کُل ہے اور، میں جمالِ کم نما

اِس حد کو دے نظرِ بے حد...................... قُلْ هُوَ ٱللَّهُ أَحَد

ترے میکدہ میں مست ہے لذت نگاہِ یار کی

سَر چڑھ کہ بولا ہے وجد...................... قُلْ هُوَ ٱللَّهُ أَحَد

شافعِ روزِ جزا_یا نبی ﷺ

یہ آپؐ نے دی ہے سند..... قُل هُوَ ٱللهُ أحَد

ذکرِ دلِ عزیز ہو، اے سیدِ عرب و عجمؐ

کرنا مدد_زیرِ لحد..... قُل هُوَ ٱللهُ أحَد

تمہارا والد،
مسافرِ حدیث

"یادوں کی روشنی میں وصال کی سرود"

میرے مہربان، قدر شناس اور دل سے جڑے احباب!

کتاب حدیثِ وصال کی اشاعت کے بعد مہربان احباب کی جانب سے موصول ہونے والی آراء و تاثرات نے میرے دل پر ایک عجب کیفیت طاری کر دی۔ جسے لفظوں میں سمیٹنا آسان نہیں۔ ایسی کیفیت جس میں آنکھیں نم ہو جائیں اور زبان خاموش۔ یہ آنسو صرف تحریر پر نہیں تھے، بلکہ اُن حسین اور مہربان یادوں پر تھے جو ثمینہ سمیع کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کی صورت آج بھی دل کو بار بار چھو جاتی ہیں اور انسان کو بے اختیار جذباتی بنا دیتی ہیں اور انسان کو اپنے اندر کہیں بہت گہرائی تک لے جاتی ہیں۔

یہ محض تحسینی کلمات نہ تھے بلکہ ایسے صادق جذبات تھے جنہوں نے دل کے نہاں خانوں میں محفوظ وہ یادیں پھر سے بیدار کر دیں جو ثمینہ سمیع کے ساتھ بسر کیے ہوئے وقت کی صورت آج بھی دل کو بار بار چھو جاتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان آرا کو پڑھتے ہوئے آنکھیں نم ہو گئیں اور دل بے اختیار ماضی کی اُن حسین اور مہربان ساعتوں میں جا ٹھہرا جو اب صرف یادوں کے سہارے ہی زندہ ہیں۔

حق یہ ہے کہ یہ کتاب کسی طے شدہ ارادے یا باقاعدہ منصوبے کے تحت وجود میں نہیں آئی۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ کتاب لکھنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب لکھنا میرے اپنے اختیار اور حوصلے سے بڑھ کر تھا۔ آٹھ برس تک میں ان یادوں کو دل کے کسی خاموش گوشے میں سنبھالے بیٹھا رہا مگر حافظ طاہر صاحب، محترمہ بہن نجیبہ عارف صاحبہ اور میری بیٹی قندیل—بیٹی ڈاکٹر فرزانہ اور اقبال شناس جویریہ بہن، آپ سب نے نہ جانے کون سا لفظ کہا، کون سی دعا دی، کون سا دروازہ کھولا کہ میرے رب نے محض دو دنوں میں وہ سب کہلوا دیا، ان مہربان ہستیوں نے نہ جانے دل کے کس بند دروازے پر دستک دی کہ میرے ربِ کریم نے محض دو دنوں میں وہ سب کہلوا دیا جو برسوں سے ضبط میں تھا جو قلم کی نوک پر بے ضبط ہو گیا۔ یہ تجربہ میرے لیے بھی غیر معمولی اور حیرت انگیز ہے، حالانکہ میں نصف صدی سے قلم و قرطاس سے وابستہ ہوں، مگر اس درجے کی آمد، اس نوع کا نزول اور اس شان کی توفیق، میری زندگی میں پہلی مرتبہ نصیب ہوئی۔

جونہی کتاب آخری مراحل میں پہنچی تو عزیزم وحید شریف صاحب کو نجانے کیسے خبر ہو گئی کہ انہوں نے بروقت مشورہ دیا کہ اس کتاب کا آغاز امہات المومنین کے نقشِ پا سے کیا جائے تو انہی کے مبارک اقدامات پر چلتے ہوئے یہ تحریر مزید بابرکت بن جائے گی۔

اس مرحلے پر یہ ذکر کئے بغیر بات مکمل نہیں ہو سکتی۔ بالخصوص بیٹی روزینہ اور بیٹے ہارون کا جذباتی سہارا ناقابلِ فراموش ہے۔ انہوں نے قدم قدم پر مجھے نہ صرف سنبھالے رکھا بلکہ میری ہر سانس کا حصہ بن گئے۔ اس کٹھن اور نازک مرحلے میں ان کی موجودگی، خاموش رفاقت اور بے لفظ دل جوئی میرے لیے ڈھال بھی بنی اور دعا بھی۔ اسی طرح اس کتاب کے ٹائٹل پر بیٹی روزینہ نے جس محبت، اخلاص اور فہمِ باطن کے ساتھ اپنا تخیل پیش کیا، وہ میرے لیے ایک حیرت انگیز تجربہ تھا۔ یوں محسوس ہوا گویا وہ خاموشی سے میرے دل میں اتر گئی ہو اور میری مستور یادوں، دبے ہوئے جذبات اور دل کے تمام جھروکوں پر اس نے بے آواز قبضہ جما لیا ہو۔

میں پورے شعور اور عاجزی کے ساتھ اس حقیقت کا اقرار کرتا ہوں کہ اس کتاب کا ہر حرف، ہر سطر اور ہر احساس محض میرے رب کا کرم ہے۔

وما توفیقی إلا باللہ۔ یہ اسی کی توفیق تھی، اسی کا کرم، اور اسی کی حکمت کہ یہ تحریر وجود میں آئی—نہ بطور کتاب، بلکہ بطور امانت۔

اہلِ دل احباب کی آرا نے مجھے اس حقیقت سے بھی آشنا کیا کہ ثمینہ سمیع کی حیاتِ مستعار محض میری رفاقت تک محدود نہ تھی؛ وہ اپنے اخلاق، اپنے وقار، طرزِ حیات اور اپنے طرزِ زیست سے بہت سے دلوں میں جگہ بنا چکی تھیں۔ اگر یہ تحریر کسی دل کو نرم کر گئی، کسی آنکھ کو نم کر گئی، یا کسی روح کو اپنے خالق کی طرف ایک قدم قریب لے آئی، تو میں اسے اس کتاب کی سب سے بڑی کامیابی سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کا مقصد پورا ہو گیا۔

میں دل کی گہرائیوں سے اُن تمام احباب کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اس کتاب کو محض مطالعے کی حد تک نہیں برتا بلکہ اسے محسوس کیا، اور مجھے یہ یقین عطا کیا کہ بعض یادیں مٹانے کے لیے نہیں ہوتیں، وہ زندہ رکھنے کے لیے ہوتی ہیں—وہ دعا، شکر اور صبر کی صورت دلوں میں زندہ رہنے کے لیے ہوتی ہیں۔

اللہ کریم ہم سب کو اپنے فضلِ خاص میں رکھے، دلوں کو شکر گزار بنائے، اور ہمیں اُن رشتوں کی قدر و پہچان عطا فرمائے جو وقت اور جدائی کی قیود سے ماورا ہوتے ہیں۔

آمین۔

آپ کا ممنون

سمیع اللہ ملک

یاد کی لو میں لکھی گئی بات

چل آ اِک ایسی نظم کہوں
جو لفظ کہوں وہ ہو جائے
بس اشک کہوں تو اک آنسو
تیرے گورے "گال" کو دھو جائے
میں "آ" لکھوں تو آ جائے
میں "بیٹھ" لکھوں تو آ بیٹھے
میرے "شانے" پر سر رکھے تو
میں "نیند" کہوں تو سو جائے
میں کاغذ پر تیرے "ہونٹ" لکھوں
تیرے "ہونٹوں" پر مسکان آئے
میں "دل" لکھوں تو دل تھامے
میں "گم" لکھوں دل کھو جائے
تیرے "ہاتھ" بناؤں پنسل سے
پھر "ہاتھ" پہ تیرے ہاتھ رکھوں
کچھ "الٹا سیدھا" فرض کروں
کچھ "سیدھا الٹا" ہو جائے
میں "آہ" لکھوں تو ہائے کرے
بے چین لکھوں "بے چین" ہو تُو
پھر میں بے چین کا "ب" کاٹوں
تجھے "چین" زرا سا ہو جائے
ابھی "ع" لکھوں تو سوچے مجھے
پھر "ش" لکھوں تیری نیند اُڑے
جب "ق" لکھوں تجھے کچھ کچھ ہو
میں "عشق" لکھوں تجھے ہو جائے

پنجابی کلام

میلیاں اکھاں دھون نہ لئیے؟
کسے بہانے رون نہ لئیے؟
ایتھے اوہنوں تکیا سی میں
ایتھے جھٹ کھلون نہ لئیے؟
ہنجواں دے فیئر موتی لے کے
تازہ ھار پرون نہ لئیے؟
نپیاں خورے پانی نکلے
تھل دی ریت ای چون نہ لئیے
آپ اوہ ہتھیں پھٹ دیوے تے؟
اک دی تھاں تے، دون نہ لئیے؟

ان قارئین کیلیئے جو پنجابی نہیں سمجھتے، اس کا اردو منظوم ترجمہ:

میلی آنکھیں ذرا دھو تو لیتے؟
کسی بہانے رو تو لیتے؟
یہیں کہیں تو میں نے اُسے دیکھا تھا
یہیں ٹھہر کر ذرا کھو تو لیتے؟
آنکھوں کے آنسو، موتیوں کی طرح سمیٹ کر
کوئی تازہ سا ہار پرو تو لیتے؟
دبا کر شاید پانی نکل آتا
تھل کی ریت ہی بھگو تو لیتے
وہ خود اگر ہاتھوں سے زخم دے دے
ایک کے بدلے دو تو لیتے؟

ایک اور پنجابی کلام

اکھیاں وِچوں نم نئیں جاندا
درد اکدھرے تھم نئیں جاندا
جاناسی تے دس کے جاندا
کوئی وی اِکو دم نئیں جاندا
راھواں تکدے انج ہو گئے آں

جیویں کوئی جم نئیں جاندا
ساڈی خاطر رویا سی او
سانوں ایہو غم نئیں جاندا

ان قارئین کیلئے جو پنجابی نہیں سمجھتے، اس کا اردو منظوم ترجمہ:

آنکھوں سے یہ نمی جاتی ہی نہیں
درد ہے کہ کہیں تھمتا ہی نہیں
جانا ہی تھا تو بتا کر جاتا
کوئی بھی یوں اچانک نہیں جاتا
راہوں کو تکتے تکتے ہم ایسے ہو گئے ہیں
جیسے کوئی جم ہی نہیں جانتا
وہ ہماری خاطر رویا تھا
بس ہمیں یہ دکھ ہی نہیں جاتا

ایک اور پنجابی کلام

بے سُرتی وچ ویکھ لیا سی
اِک کلموہا سفنا
کھسماں کھانیاں اکھاں نے وی
رج شریکاں پٹیا
راہ وچ رَت جگر دی روہڑی
پیریں چانن مِدھیا
دکھ کلہنے ویری ہو گئے
اے ہہ کھیکھن نہ مکیا
لکھ چلتر
ٹونے کیتے
عشق داہڑھ نہ رکیا
چندری رات وی او کھی کٹی
شوہدا دن وی سَینتاں مارے
اپنے سر وچ کھیہہ کی پانی
میسنی چپ وی دندیاں وڈے

کیہدی ماں نوں ماسی آکھاں

کیہدا کراں سیاپا

اونتر جانیاں یاداں تیریاں

ٹُٹ پینا اکلاپا

ان قارئین کیلئے جو پنجابی نہیں سمجھتے، اس کا اردو منظوم ترجمہ:

بے سُری زندگی میں بھی

ایک بے نام اور برا سا خواب دیکھا تھا

بد دعا دینے والی آنکھوں نے بھی

جی بھر کے دشمنوں کو کوسا تھا

راستے میں خون جگر کی کنکریاں تھیں

چاند کی چاندنی کو قدموں کے نیچے خوب مسلا

دکھ بھی تنہا ہو کر دشمن بن گئے

لیکن پھر بھی یہ عذاب ختم نہیں ہوا

لاکھ فریب

ٹوٹکے کیے گئے

مگر عشق کا سیلاب نہ رکا

تمہاری یادوں میں گزری رات بڑے عذابوں میں گزری

اور یہ دشمنی پر اترا ہوا دن بھی طعنے دے رہا ہے

اپنے ہی سر پر راکھ اور پانی پڑا

مکاری سے بھری خاموشی نے بھی دانت تک کٹا دیے

کس کی ماں کو خالہ کہہ کر پکاروں

کس کے لیے بین کروں

اور اندر ہی اندر تیری یادیں

اور اکیلے پن اور جدائی کا غم چکنا چور کر کے مار ڈالے گا

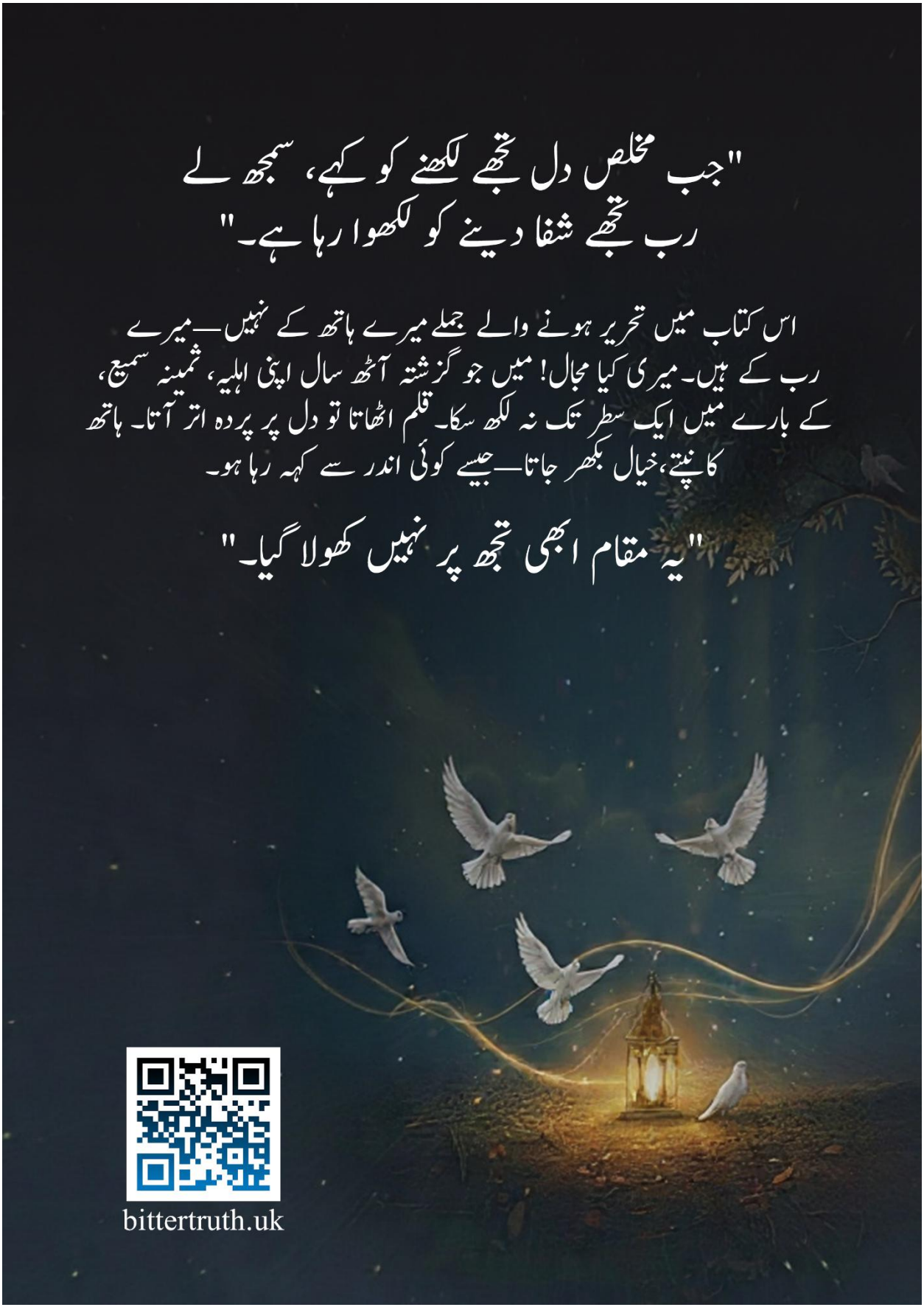
"جب مخلص دل تجھے لکھنے کو کہے، سمجھ لے
رب تجھے شفا دینے کو لکھوا رہا ہے۔"
اس کتاب میں تحریر ہونے والے جملے میرے ہاتھ کے نہیں—میرے
رب کے ہیں۔ میری کیا مجال! میں جو گزشتہ آٹھ سال اپنی اہلیہ، ثمینہ سمیع،
کے بارے میں ایک سطر تک نہ لکھ سکا۔ قلم اٹھاتا تو دل پر پردہ اتر آتا۔ ہاتھ
کانپتے، خیال بکھر جاتا—جیسے کوئی اندر سے کہہ رہا ہو۔
"یہ مقام ابھی تجھ پر نہیں کھولا گیا۔"
bittertruth.uk